ہفت روزہ

افق

کراچی

۲۰-۲۷ ستمبر ۱۹۷۳ء



قیمت ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

بنّے بھائی ہم سے جُدا ہوگئے



سجاد ظہیر

- وقائع نویس -

سجاد ظہیر، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر نے جب ترقی پسند افسانوں کا مجموعہ انگارے شائع کیا تو پورے ملک میں کھلبلی مچ گئی۔ رجعت پسند اور روایت پسند انگاروں پر لوٹنے لگے۔ انہوں نے اس یادگار مجموعے کے خلاف جی بھر کے زہر افشانی کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کتاب کے مرتبین کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے حوصلے متزلزل نہ ہوئے۔ انہوں نے شدید مخالفت کے طوفان میں اپنا انقلابی کام جاری رکھا۔

سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی تھے۔ جدید اردو ادب میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انکی اچانک موت سے برصغیر پاک و ہند کی ادبی اور سیاسی دنیا ایک مرصع اور سحر انگیز شخصیت سے محروم ہوگئی۔ گزشتہ ایک سال سے وہ لندن، برلن، ماسکو، تاشقند، کابل اور ہندوستان میں امیر خسرو کے بارے میں مواد جمع کرنے میں مصروف تھے۔

سجاد ظہیر، سر سیّد وزیر حسن کے چوتھے صاحبزادے تھے۔ سر وزیر حسن لکھنؤ ہائی کورٹ کے سابق چیف جج تھے۔ سجاد ظہیر نے آکسفورڈ سے گریجویشن کیا تھا۔ ان کی شادی ۱۹۳۷ء میں اردو کی ایک ممتاز ناولسٹ اور افسانہ نگار خاتون رضیہ سجاد ظہیر سے ہوئی۔

انہوں نے لندن میں قیام کے دوران سامراج دشمن تحریکوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ سیاسی سرگرمیوں کے دوران سوشلزم سے گہری دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس سائنٹیفک نظریہ کو سمجھنے کے لئے ڈوب کر مطالعہ کیا۔ بہت جلد انہوں نے نوجوان برطانوی ادیبوں اور دانشوروں کے ایک گروپ میں شمولیت اختیار کر لی، جس میں آڈن، اسٹیفن اسپینڈرز، لوئیس میک نائیس، رالف فاکس جیک لنڈسے، ڈیوڈ گیسٹ، کورن فورتھ اور ملک راج آنند شامل تھے۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبان پر خاصہ عبور رکھتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے خیالات اور نظریات کے اظہار کے لئے اردو کو منتخب کیا جس سے وہ والہانہ پیار کرتے تھے۔ انہوں نے لندن میں قیام کے دوران "لندن کی ایک رات" لکھا۔

سجاد ظہیر نے پاکستان

آنے کے لئے ممتاز دولتانہ

سے ملاقات کی تھی!

اس کے بعد انہوں نے اردو میں مختصر افسانے بھی لکھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے قبل انہوں نے برصغیر کے تمام جیّد اور اعلیٰ ادبی شخصیتوں سے اس کے بارے میں بات چیت کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ ان میں ڈاکٹر اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، قاضی عبدالغفار، مسز سروجنی نائیڈو، میاں بشیر احمد، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولانا حسرت موہانی، مولانا چراغ حسن حسرت، اور جوش ملیح آبادی کے علاوہ کئی دوسرے بزرگ ادیب اور دانشور شامل ہیں۔ ان کے ہم عصروں نے جن میں فیض احمد فیض، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر احمد علی، پروفیسر فراق گورکھپوری، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی شامل ہیں، اس تحریک کی زبردست عملی حمایت کی۔ مذکورہ بالا ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں سے اس تحریک کے ہر پہلو پر اچھی طرح گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے عملی قدم اٹھایا۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت اردو کے مایہ ناز ادیب اور افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر کو انجمن کا پہلا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء میں اسیری کے دوران سجاد ظہیر نے کئی ایک ادبی مقالات قلمبند کئے، جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ترجمان رسالے "نیا ادب" میں گمنام ناموں سے شائع ہوئے۔ قید سے رہائی کے بعد وہ بمبئی منتقل ہوگئے۔ وہاں انہوں نے "قومی جنگ" کی ادارتی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔ اس کے علاوہ انہیں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکزی کمیٹی میں رکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

سیاسی سرگرمیوں کے دوران انہوں نے اردو ادب کی خدمت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ بمبئی میں پہلی بار یوم غالب کا انتظام کیا۔ اس کے بعد یوم شبلی منایا گیا۔ ان دونوں تقریبات میں مختلف حلقہ فکر کے ادیبوں نے شرکت کی۔ وہ وسیع القلب اور ملنسار طبیعت کے

باقی صفحہ ۳۰ پر

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

مدیر
وہاب صدیقی

۲۰ - ۲۷ ستمبر ۱۹۷۲
قیمت : ـــــ ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

الفتح

جلد :- ۴ شمارہ :- ۱۹

خاص مضامین

چلی میں آئی۔ ٹی۔ ٹی کی سازش کامیاب ہو گئی - ۷
چپراسی کے پنشن کا فائل پانچ مرتبہ گم کر دیا گیا - فضل الٰہی ۹
ہاریوں کی بے دخلیاں - الفتح رپورٹ ۱۱
ادھر کا کھیت رشید احمد صدیقی ۱۳
صحافت پر پابندیاں اختر رحمان ۱۶

سرورق : انور سمیع
عکاس : گرینگو
فون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

آج کا بحران، کل کی تیاریاں

ملک میں معاشی ابتری تیزی سے پھیل رہی ہے۔ صبحِ نو کا سورج مہنگائی، فاقوں اور بیروزگاری میں اضافے کا پیامبر بن گیا ہے۔ جسے دیکھو مجبوری اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم قحط کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ننگے، بھوکے اور نحیف و ناتواں انسانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی کلمہ ہے "کہاں جائیں۔"

یہ صورتِ حال غیر متوقع نہیں۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ نے ملک کی معیشت کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ موجودہ نظام میں اس کا تمام تر بوجھ عام آدمی کو برداشت کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ حکومت نے ان نقصانات کو پورا کرنے کے لئے جو پالیسی اختیار کی، اس کی وجہ سے اشیائے خوردنی تک کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، گھی ناپید ہوا، سبزیاں عنقا ہو گئیں، دالیں امراء کی غذا میں شمار کی جانے لگیں غریبوں کے لئے گوشت کا نام اس طرح سے سنا جانے لگا۔ جیسے کسی فاقہ زدہ خاندان کے ہاں حلوہ پکانے کی خیالی تیاریاں کی جاتی ہوں۔

ملکی معیشت کی تباہی میں بعض بدعنوان اربابِ اختیار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے ایسے نازک ترین حالات میں بھی اپنی تجوریاں بھریں، اسمگلنگ کی پشت پناہی کی، بھاری رشوتیں لیں، اقربا پروری کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ دیئے اور اس طرح جہاں پرانے بائیس خاندان اپنے سرمایہ کو غیر ممالک میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے وہاں نئے بائیس خاندان پیدا ہو گئے۔

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۷/۸ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

حکومت کے ان ناعاقبت اندیش دوستوں نے صحیح معنوں میں دشمن کا کردار ادا کیا اور اس گھر کو آگ لگانے میں اسے اپنی ہی صفوں میں سے لوگ مل گئے۔ ان کا محاسبہ تو کجا، انہیں اپنی حرکتوں سے باز رکھنے کی کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی گئی اور یہ لوگ بدمست ہاتھی کی طرح پوری قوم کو اپنے قدموں تلے روندتے رہے۔

وزیر اعظم بھٹو جنگ کے بعد کے اثرات کو عوام کے بھرپور تعاون کی بدولت زائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اگر انہیں اپنی صفوں میں ان دشمنوں سے واسطہ نہ پڑتا۔ پاکستان کے عوام دنیا بھر کے محنت کشوں کی طرح ہر مصیبت سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی جفاکشی مسلمہ ہے، مگر جب پالیسی ساز ادارے یہ تاثر دیں کہ قربانی کا بکرا صرف عوام ہیں اور حکمران طبقہ بدستور زندگی کی تمام درآمد شدہ آسائشوں سے بہرہ ور ہے تو معاشی ابتری کے ساتھ سیاسی انتشار بھی جنم لیتا ہے۔ اس سیاسی انتشار کو حکومت کی اُس پالیسی نے مزید تقویت پہنچائی جس کے تحت پُرانا سرمایہ دار اپنے اثاثے غیر ممالک میں منتقل کرنے پر مجبور ہوا اور جاگیردار کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیدیا گیا اور خام اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کے ذریعے اس کی دولت کے ذخائر بڑھے۔

معاشی بدحالی کو مزید تقویت سیلاب کی تباہ کاریوں نے پہنچائی، اور اس طرح رہی سہی کسر نکل گئی۔ اب قحط کا سامنا ہے، اس سے نجات کے لئے عوام کو کٹھن جدوجہد سے گزرنا پڑے گا۔ سیاسی شعبدہ باز ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد حصولِ اقتدار ہے، عوام دوستی ہرگز نہیں۔ آج کے حالات میں عوام مہنگائی، بے روزگاری اور معاشی بے چینی کی وجہ سے گلیوں تک کا رُخ اختیار کر سکتے ہیں۔ اس سے یہی شعبدہ باز اور نام نہاد عوامی رہنما بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوششیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ کسی چہرے کی تبدیلی میں تو رونما ہو سکتا ہے لیکن عوام کے مسائل کا حل نہیں ہوگا۔ اور عین ممکن ہے کہ نئے چہرے مزید معاشی ابتری کو جنم دیں اور عوام دشمن پالیسی پر گامزن ہوں۔

ان حالات میں عوام کی صحیح معنوں میں انقلابی جماعت ہی رہنمائی کا فرض ادا کر سکتی ہے۔ بائیں بازو کے جیالے اور بہادر کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ منظم ہوں، متحد ہوں اور جاگیرداروں اور ان کے بظاہر مخالف لیکن دراصل ان کے ہی طبقے کے اقتدار سے محروم نام نہاد رہنماؤں کی چالوں سے عوام کو بچائیں۔ اس وقت عوام چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں، اور اس چکی کا مقصد موجودہ سامراجی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھنا ہے۔ ۲۶ سال کی تاریخ گواہ ہے کہ ایوب نے عوام کے نام پر اقتدار سنبھالا اور پھر عوام کو ہی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ایوب کے خلاف عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بے مثال قربانیاں دیں تو ایوب نے اقتدار عوام کے حوالے کرنے کی بجائے یحییٰ خان کو سونپ دیا اور یحییٰ خان نے بھی اپنے پیشرو کی طرح قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی سالمیت کے لئے فوج کو عنان اقتدار سنبھالنا پڑی ہے۔ یحییٰ نے اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے اپنی سی کوشش کی مگر اُسے عوام کے فیصلے کے سامنے جھکنا پڑا۔ حکومت پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب بھٹو کو مل گئی۔ اب بھٹو صاحب کے اقتدار کو پونے دو سال ہوگئے ہیں اور وہ کونسی مصیبت نہ ہوگی جس سے عام آدمی دوچار نہ ہوا ہو۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ ۲۶ سال پُرانا نظام آج بھی موجود ہے۔ اور جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہوگا، جاگیرداری نظام بالکل ختم نہیں ہوگا۔ کھیت کسانوں کی ملکیت قرار نہیں پاتے، عوام کو قومی آزادی میسّر نہیں ہوگی۔ قومی آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے قومی محاذِ آزادی قائم کرنا ہوگا اور گروہی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف مشترکہ جدوجہد کرنا ہوگی۔

مسئلہ جناب بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے سے حل نہیں ہوگا، مسئلہ نظام کو تبدیل کرنے سے حل ہوگا۔ ایسی کوئی مہم جس کا مقصد چہرے تبدیل کرنا ہو، سیاسی کارکنوں کو اس میں شامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اُن کی شمولیت تضیع اوقات اور ایک صورت میں عوام کے مفاد کے خلاف ہوگی۔ انہیں اپنا تمام وقت، توانائی اور ذرائع اپنی جماعت کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں صرف کرنا چاہیئے۔



مہنگائی کا بھوت دانت

نکالے قہقہے لگا رہا ہے

ناقص اقتصادی منصوبہ بندی کے سبب قیمتوں میں اضافہ

● — ۱۰ اگست۔ گھی، آٹے، چاول اور کھاد کے نرخوں میں اضافہ کردیا گیا۔ اب بناسپتی گھی چار روپے ۷۵ پیسے فی سیر کی بجائے چھ روپے سیر، راشن کا آٹا ۱۸ روپے ۷۳ پیسے فی من کی بجائے ۲۳ روپے من ملے گا۔ (ڈاکٹر مبشر کا اعلان)

● — ۱۵ ستمبر۔ چینی پر ۵۰ پیسے فی سیر سیلاب سرچارج لگا دیا گیا۔ گھریلو استعمال کے لئے چینی کی خوردہ قیمت تین روپے فی سیر مقرر کی گئی۔ ہوٹلوں، حلوائیوں اور دیگر اداروں کے لئے چار روپے فی سیر مقرر کی گئی۔ پان، چھالیہ، مصالوں پر درآمدی محصول بڑھا دیا گیا۔ سگریٹوں پر سرچارج لگا دیا گیا اور باسمتی چاول زیادہ سے زیادہ برآمد کرنے کا اعلان کردیا گیا۔

(صدارتی آرڈی ننس)

ایک ہی ماہ میں دو مرتبہ قیمتوں میں اضافہ کیا گیا۔ مہنگائی کا بھوت اپنے بدنما دانت نکالے زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔ محنت کش عوام گرانی کے بھوت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ متوسط طبقہ بھی بے بس اور مجبور نظر آتا ہے۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد کا جرمنی کا نقشہ سامنے آرہا ہے۔ جب جرمنی میں بوری بھر نوٹوں کے بدلے میں ایک سیر آلو بھی نہیں ملتے تھے۔ ایک سگریٹ خریدنے کیلئے تھیلے میں مارک بھر کرلے جانے پڑتے تھے۔ یا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک انقلابِ چین سے قبل کی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس زمانہ میں چین میں اشیاء کے نرخ ہر ایک آدھ گھنٹے کے بعد بڑھ جایا کرتے تھے۔ آج ہمارے ہاں بھی یہی حالت ہے۔ بازار جاکر اشیائے صرف کے نرخ پوچھو تو دل دھک سے ہوکر رہ جاتا ہے۔ ایوب خان کے زمانہ میں چینی کی قیمت اضافہ ہوا تھا تو عوام اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ آٹا بیس روپے من ہوا تھا تو حبیب جالب چیخ اُٹھا تھا۔

بیس روپیہ من آٹا، اس پہ بھی ہے سناٹا

آج راشن کا آٹا ۲۳ روپے من ہوگیا ہے۔ بازار میں ایک روپیہ ۱۳ پیسے فی سیر کے حساب سے بک رہا ہے۔ چینی، جس کی سپلائی پر سرکاری کنٹرول ہے، تین روپے سیر ہوگئی ہے۔ ہر چہرے پر خوف کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ہر لمحہ صدیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ غریبوں کے گھروں میں صرف آنسو اور سسکیاں ہیں۔

مہنگائی بڑھتی جارہی ہے۔ اشیائے صرف کے نرخ اُڑن طشتری کے مانند محنت کش عوام کی پہنچ سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ ۵۰ پیسے فی سیر مل رہی ہے۔ ٹیکسوں کی بھرمار ہے لیکن اربابِ اقتدار ایک ہی تان اور ایک ہی رٹ لگا رہے ہیں۔ کورس کے انداز میں کہا جارہا ہے "ٹیکسوں کا بوجھ عام آدمی پر نہیں پڑے گا، اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوگا۔" اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں، انہیں تو گرانی کا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا، ان کے پاس دولت کی کمی نہیں، ہر چیز آسانی سے فراہم ہوجاتی ہے۔ پیاس کی شدت کا احساس صرف پیاسے ہی کو ہوسکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں لوگوں کی تنخواہوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ وفاقی وزیرِ خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن نے ۱۰ اگست کو قیمتوں میں اضافے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "سات سو روپے ماہانہ تک تنخواہ پانے والے تمام سرکاری ملازمین اور تجارتی و صنعتی اداروں کے ملازمین کی تنخواہوں میں یکم اگست ۷۳ء سے ۳۵ روپے کا اضافہ کردیا گیا ہے۔" اس اعلان کے دوسرے ہی دن اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ تو کردیا گیا لیکن تجارتی و صنعتی اداروں کی اکثریت نے تنخواہوں میں ۳۵ روپے کا اضافہ کرنے سے انکار کردیا۔ کیا ہم اربابِ اقتدار سے یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتے ہیں کہ ان کا کام صرف احکامات جاری کرنا ہے، احکامات پر عمل درآمد کرانا نہیں ہے۔ کیا حکومت وسیع اختیارات، ریاستی مشینری، فوج، ہتھیار اور پولیس رکھنے کے باوجود صنعت کاروں اور سرمایہ داروں سے اپنے احکامات کی تکمیل نہیں کرواسکتی۔

مہنگائی کے اسباب یہ ہیں۔

- افراطِ زر۔
- ناقص معاشی پالیسیاں۔
- چور بازاری، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ۔
- موجودہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام۔

وفاقی وزیرِ خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن نے وفاقی بجٹ پیش کرتے وقت دعویٰ کیا تھا کہ یہ بجٹ افراطِ زر کی روک تھام

ں اقتصادی منصوبہ بندی نہ کرنے کے سبب زرِ زر پر کنٹرول نہیں کیا جا سکا۔ جب بھی ضرورت محسوس ہوئی کروڑوں روپے کے کرنسی نوٹ سونے کی حمایت کے بغیر چھاپ کر مارکیٹ میں پہنچا دیئے۔ نومبر ۷۰ء میں ۴۰۷ کروڑ روپے گردش میں تھے، جو نومبر کے آخر تک ۸۶۶ کروڑ کر دیئے گئے۔ نومبر ۷۲ء میں ۹۸۵ کروڑ روپے گردش میں تھے، اور اپریل ۱۹۷۳ء میں ان کی تعداد ۱۰۰۰ کروڑ روپے کر دی گئی۔ گویا دو سال کے عرصہ میں ۲۹۶ کروڑ روپے سرکولیشن میں زیادہ کر دیئے گئے۔ جب کہ مجموعی قومی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ حالانکہ کرنسی نوٹوں کی گردش میں اضافے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد انتظامی امور کے اخراجات میں تقریباً ۴۰ فیصد کمی ہو گئی تھی۔ دوئم یہ کہ جب ۴۰۷ کروڑ روپے دونوں بازوؤں کے لئے کافی تھے تو آدھا ملک گنوانے اور آبادی میں ۵۵ فیصد کمی ہو جانے کے بعد زیادہ نوٹ چھاپنے کی کیا ضرورت تھی۔ سوئم مشرقی پاکستان میں جو بیرونی قرضے صرف کئے گئے، حکومتِ پاکستان نے اُن کی ادائیگی کے لئے انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں زیادہ نوٹ چھاپنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ حکومت نے دوسری سنگین غلطی یہ کی کہ پاکستانی کرنسی کو ڈالر سے منسلک کر دیا۔ حالانکہ ڈالر روبہ زوال ہے۔ حکومت کی انہی پالیسیوں کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "موجودہ حکومت پرنٹنگ پریس کے ذریعے چلی آ رہی ہے۔ زائد کرنسی نوٹ کی گردش سے افراطِ زر اور قیمتوں میں اضافہ ہونا ایک لازمی امر ہے۔

موجودہ حکومت کی معاشی پالیسیاں ناقص ہیں صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کی پالیسی نیم دلانہ ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تمام صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیتی۔ لیکن حکومت نے ابتداء میں چند صنعتیں سرکاری تحویل میں لے لیں۔ اور پھر اعلان کیا گیا کہ آئندہ کوئی صنعت سرکاری کنٹرول میں نہیں لی جائے گی۔ لیکن گماشتہ سرمایہ داروں نے اس پر یقین نہ کیا اور اپنے صنعتی ادارے فروخت کر کے تمام سرمایہ بیرونِ ملک منتقل کر لیا۔ اس کا واضح ثبوت ولیکا ٹیکسٹائل اور چارسدہ پیپر ملز کی فروخت ہے۔ حکومت نے نہ تو غیر ممالک میں سرمایہ کی منتقلی پر پابندی لگائی اور نہ ہی سرمایہ داروں کو بیرونِ ملک جانے سے روکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی کثیر دولت باہر چلی گئی۔ گماشتہ سرمایہ داروں کے پاس غیر ملکوں کی شہریت ہے۔ وہ وہاں چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ ان کے بچے ایسے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جہاں کی ماہانہ فیس ۱۰۰ ڈالر ہے۔

حکومت نے جب صرف ملکی بناسپتی گھی کی صنعت کو سرکاری کنٹرول میں لیا تو یہ تاثر پیدا ہوا کہ حکومت اشیائے صرف بنانے کی صنعت کو سرکاری کنٹرول میں لینا چاہتی ہے۔ ملکی سرمایہ داروں کو دبانا چاہتی ہے، اور غیر ملکی سرمایہ داروں

باقی صفحہ ۲۱ پر



ایوب خان کو صنعتکاروں نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ دیا

۲۵ روپے فی کھڈی اور ۲ روپے فی تکلے کی شرح سے چندہ لیا گیا

۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات جیتنے اور انتخابی مہم کے اخراجات کے لئے ایوب خان اور انکی جماعت کنونشن مسلم لیگ نے پاکستان کے صنعت کاروں اور تاجروں سے ڈیڑھ کروڑ روپے کا چندہ لیا تھا۔ ٹیکسٹائل ملز مالکان سے ۲۵ روپے فی کھڈی اور دو روپے فی تکلے کی شرح سے چندہ لیا گیا۔ یہ انکشاف ہربرٹ فلڈ مین نے اپنی کتاب "بحران سے بحران تک۔ پاکستان ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۹ء" میں کیا ہے۔

پاکستان کے صنعت کار، سرمایہ دار اور جاگیردار تمام سیاسی جماعتوں کو ان کی مقبولیت کے اعتبار سے فنڈ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کے مفادات کا تحفظ کریں۔ برسرِ اقتدار پارٹی کو زیادہ روپیہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ ملز لگانے کے اجازت نامے، درآمدی اور برآمدی پرمٹ مل جائیں "شاہ" کی نظروں میں وقعت بڑھ جائے۔ اور شاہ نوازتے وقت ان کا بھی خیال رکھے۔ بعض سیاسی جماعتیں عوام سے بھی چندہ وصول کرتی ہیں۔ بعض اوقات مذہب کی آڑ میں کاروبار چلایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے دوران جماعت اسلامی نے "تحفظ نظریہ پاکستان فنڈ" قائم کیا۔ اور ایک روایت کے مطابق ڈیڑھ کروڑ روپیہ جمع کیا۔ لیکن آج تک عوام کو یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ فنڈ کہاں خرچ کیا گیا۔

پاکستان کی سیاسی جماعتوں پر غیر ملکی امداد لینے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ جون ۱۹۷۰ء میں وزارتِ داخلہ کے سابق سیکرٹری انٹیلی جنیس کے سابق سربراہ مسٹر اے۔ بی اعوان نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ بعض سیاسی جماعتوں کو غیر ممالک سے امداد ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان کا الزام صحیح ہو کیونکہ وہ حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انٹیلی جنیس کی رپورٹیں ان کی نظروں سے گزرتی ہوں گی۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام سیاسی جماعتوں کو عطیات اور چندے کا حساب ظاہر کرنے کا حکم دے تاکہ تمام لوگ حقیقی صورتحال سے آگاہ ہوں۔



ڈاکٹر ایلنڈے



انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف

کارپوریشن کی سازش کامیاب ہوگئی

سازش کا منصوبہ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں تیار کیا گیا

بالآخر چلی میں سامراجی سازشیں کامیاب ہو گئیں۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۳ء کو صدر ایلنڈے کی مارکسی حکومت کا تختہ فوجی انقلاب کے ذریعے الٹ دیا گیا۔ صدر ایلنڈے نے خودکشی کرلی اور فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل آگسٹو نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔

برطانوی خبر رساں ادارے رائٹر کے مطابق باغی فوجی جرنلوں نے صدر ایلنڈے کو الٹی میٹم دیا کہ وہ استعفیٰ دیدیں، ورنہ انہیں زبردستی ایوانِ صدارت سے نکال دیا جائے گا۔ صدر ایلنڈے نے یہ حکم ماننے سے انکار کردیا۔ اور ریڈیو سانیتاگو سے محنت کش عوام، طلبہ سے اپیل کی کہ "وہ انقلاب کے خلاف سازش کو ناکام بنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ میں آخری دم تک بغاوت کا مقابلہ کروں گا اور اس میں مرجانا بھی پسند کروں گا۔" صدر ایلنڈے کی اپیل پر چلی کے محنت کش عوام، طلبہ اور عوام دوست عناصر سڑکوں پر نکل آئے۔ انہوں نے دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جن پر جلی حروف میں لکھا تھا: "ایلنڈے! ایلنڈے ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تمہارا دفاع کریں گے۔" سانیتاگو میں مزدوروں اور نوجوانوں کے بڑے بڑے ہجوم "ایلنڈے! ایلنڈے" چیختے ہوتے سڑکوں پر نکل آئے۔ باغی فوجیوں نے ان پر گولیوں کی بارش کی، اور وارننگ دی کہ عوام گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ سانیتاگو میں کرفیو لگادیا گیا۔ اسی اثناء میں صدر ایلنڈے نے اپنے منہ پر گولی مار کر خودکشی کرلی۔ اور اپنا یہ قول سچ کر دکھایا کہ وہ شکست ماننے کی بجائے مرجانا پسند کریں گے۔

۱۴ ستمبر کو بری فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل آگسٹو نے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ چلی کی پارلیمنٹ جو کانگریس کہلاتی ہے کو توڑ دیا۔ اور پندرہ رکنی وزارتی کابینہ تشکیل دی۔ جس میں تیرہ ارکان کا تعلق فوج سے ہے۔ فوجی حکومت نے کیوبا سے سفارتی تعلقات توڑ دیئے۔ لیکن چلی کے عوام نے موجودہ حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے۔

۶۵ سالہ ڈاکٹر ایلنڈے ۱۹۷۰ء میں جمہوری انتخابات میں ایک تہائی اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے۔ وہ جمہوری طریقے سے سوشلسٹ اور مارکسٹ نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ اقتدار میں آنے سے قبل ان کی پارٹی مارکسی پارٹی نے عوام سے انقلابی اصلاحات کا وعدہ کیا تھا۔ ڈاکٹر ایلنڈے نے کہا تھا کہ چلی کے عوام کا استحصال کرنے والی غیر ملکی کمپنیوں، اداروں

INTERNATIONAL TELEPHONE AND TELEGRAPH CORPORATION
1707 L STREET, N. W.
WASHINGTON, D.C. 20036

WILLIAM R. MERRIAM
VICE PRESIDENT
DIRECTOR, WASHINGTON RELATIONS

October 1, 1971

The Honorable
Peter G. Peterson
Assistant to the President
for International Economic Affairs
Old Executive Office Building
Washington, D. C. 20500

Dear Pete:

When Mr. Geneen lunched with you a few weeks
he stated he feared ITT's seventy per cent owned
n Telephone Company (Chiltelco) would soon be
iated. This has now happened! The take-over
eptember 29, 1971.

Mr. Geneen said, we anticipated this action
mpting to delay or prevent it. However,
month, the Chilean government moved

انٹرنیشنل ٹیلیفون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کے نائب صدر مسٹر،

چلّی کے محنت کشوں نے فوجی جنتا کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے

اور معدنی وسائل کو قومیا لیا جائے گا بڑی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ استحصال کا مکمل طور پر خاتمہ کر کے سوشلسٹ بنیادوں پر ملک کی تعمیر نو کی جائے گی۔ مارکسی



انٹرنیشنل ٹیلیفون اینڈ ٹیلیگرات کارپوریشن
کے نائب صدر ولیم آر میریم

پارٹی کے ان اعلانات سے چلّی کے سرمایہ دار اور غیر ملکی کمپنیاں سخت خوفزدہ تھیں۔ انہوں نے انتخابات کے دوران مارکسی پارٹی کے خلاف زبردست سازشیں کیں۔ جوڑ توڑ کئے اور اپنی دولت کا منہ کھول دیا۔ مگر عوام کی زبردست حمایت کے سبب تمام عوام دشمن اور سامراجی منصوبے ناکام ہو گئے۔ مارکسی پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ مارکسی پارٹی کی اس کامیابی نے غیر ملکی کمپنیوں کے مالکان کی نیندیں حرام کر دیں۔ صدر ایلنڈے کی حکومت کا تختہ الٹنے کی پہلی سازش انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن نے تیار کی۔

انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کے مالکان امریکی تھے۔ چلی کی ۷۰ فی صد ٹیلی فون کمپنیوں پر اس کارپوریشن کی اجارہ داری تھی۔ انٹرنیشنل ٹیلی فون کارپوریشن اس خوف میں مبتلا تھی کہ اگر مارکسی صدر نے اپنے وعدے کے مطابق غیر ملکی کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا اور ان کی املاک کو ضبط کر لیا تو اس عمل سے امریکی سرمایہ داروں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ کارپوریشن نے چلّی کے بعض سرمایہ داروں سے ساز باز کر کے مارکسی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تیار کیا۔ چلّی میں کام کرنے والے سی آئی اے کے ایجنٹوں نے کارپوریشن کے اس خفیہ

اور سنسنی خیز منصوبے میں ہر قدم پر ساتھ دیا اور ان کی ہدایات پر ۱۸ نکات پر مشتمل دستاویز تیار کی گئی۔

نکسن حکومت نے اس منصوبے پر عمل تو نہیں کیا۔ لیکن چلّی حکومت کو جھٹکا لگانے کے لئے اپنے طور پر چند اہم اقدامات کئے۔ اور چلّی کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے دی جانے والی امداد اور قرضے بند کر دیے۔

چلّی کے مارکسی صدر کا تختہ الٹنے کے لئے جو یادداشت تیار کی گئی، اس کے روحِ رواں انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کے نائب صدر ولیم آر، میریم اور صدر نکسن کے اسسٹنٹ پیٹر جی پیٹرسن برائے بین الاقوامی اقتصادی امور تھے۔ یہ آج کل کامرس سیکرٹری کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ چلّی میں کارپوریشن نے تقریباً ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی۔

آئی ٹی ٹی نے مارکسی سوشلسٹ حکومت کے خلاف جو منصوبہ تیار کیا۔ اس میں سب سے پہلے چلّی کو اقتصادی طور پر تباہ کرنے کے لئے بیرونی امداد اور قرضوں کی فراہمی روک دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اقتصادی بدحالی کے سبب عوام میں بے چینی اور انتشار بڑھ جاتا۔ جگہ جگہ عوام کو تشدد اور لاقانونیت پر اکسایا جاتا۔ ہنگامے اور توڑ پھوڑ کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ اس کے نتیجے میں مسلح افواج کو پیش قدمی کرنی پڑتی۔ مارکسی حکومت کا خاتمہ کر دیا جاتا اور آئی ٹی ٹی اور ملکی سرمایہ دار احتساب سے بچ جاتے۔ رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ اس چھ ماہ کی مدت میں سی آئی اے کے ایجنٹ سرگرم عمل ہوں گے۔ وہ اس آگ کو ہوا دیں گے۔ چلّی کی نیوی اور ایئر فورس میں بے چینی پیدا کرنے کے لئے ایندھن کی سپلائی میں رکاوٹ ڈالی جائے گی۔ اس صورتِ حال سے فوری طور پر نمٹنا صدر سلوڈار کے امکان سے باہر ہو گا اور وہ ہراساں ہو کر اقتدار سے دست بردار ہو جائیں گے۔

آئی ٹی ٹی کارپوریشن کے نائب صدر ولیم آر میریم نے صدر نکسن کے اسسٹنٹ مسٹر پیٹرسن کو رپورٹ کے ساتھ جو مراسلہ بھیجا، اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ۔

"چلّی کی صورتِ حال بڑی اہمیت اختیار کر چکی ہے ہماری حکومت کو ایسے موثر اور اہم اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ ایلنڈے پیچیدہ حالات میں گرفتار ہو جائے۔ اس کا بچ نکلنا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو۔ اس طرح وہ اپنے منصوبے میں ناکام ہو جائے گا۔"

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو مسٹر میریم نے صدر نکسن کے خصوصی مشیر ہنری کسنجر کو ایک خط لکھا، جس میں اُس نے چلّی کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"انٹرنیشنل ٹیلیفون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کی انتظامیہ یہاں رونما ہونے والے واقعات کو سخت تشویش ناک نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ ہم اس بات سے پوری طرح مطمئن ہیں کہ موجودہ صورتحال سے فائدہ اٹھا کر لاطینی امریکہ میں امریکی پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔"

مسٹر ہنری کسنجر نے ۹ نومبر کو اس مراسلے کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

"آپ کے خیالات اور سفارشات سے ہمیں بے حد مدد ملی۔ اس سلسلے میں ہم یقیناً چند اقدامات روبہ عمل لانے والے ہیں۔"

واشنگٹن میں انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کے سرگرمیوں کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بٹھائی گئی۔ اس کمیٹی کے ایک رکن نے ۱۴ جون کو رپورٹ کی ایک کاپی خفیہ طریقے سے نیویارک ٹائمز تک پہنچا دی۔ اُس نے اپنا نام ظاہر کرنے سے منع کر دیا۔ رپورٹ میں امریکی حکومت نے اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر چلّی کی مسلح افواج نے بغاوت کر دی تو اُسے ہر طرح سے مالی اور مادی امداد فراہم کی جائے گی۔

باقی صفحہ ۲۹ پر



پیٹر جی پیٹرسن۔ صدر نکسن کے بین الاقوامی اقتصادی امور کے مشیر

بدعنوانیوں کا شکار ہونیوالوں کی داستان

• فضل الٰہی •

چپراسی کے پنشن کا فائل پانچ مرتبہ گم کیا گیا

مٹھی گرم کردو، جی پی فنڈ کی رقم مل جائے گی

علی نواز

سے میری ملاقات کمپٹرولر سندھ کے دفتر میں ہوئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے کے دوران کئی بار رُکا، اور اپنی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کو درست کیا۔ وہ ضعیف العمر اور انتہائی کمزور آدمی تھا۔ داڑھی کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی۔ میلی سی پگڑی کا نصف حصّہ کھل کر بے ترتیبی سے اس کے ناتواں کندھوں پر جھول رہا تھا۔ میں اسے سہارا دے کر بالائی منزل پر لے گیا، جہاں جی پی فنڈ اور پنشن کا کام ہوتا ہے۔ وہ دفتر کے دروازہ پر بیٹھ کر بُری طرح ہانپنے لگا۔ مجھے اس کی اس حالت پر بڑا رحم آیا۔ اس کی عمر چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے کی تھی۔ لیکن مجبوری اسے کمپٹرولر سندھ کے چکر لگوا رہی تھی۔

جب اس کی سانس قدرے درست ہوئی اور وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے کہا۔ ”بابا تم بیمار دکھائی دیتے ہو، گھر پر آرام کرنا چاہیئے تھا“

علی نواز جھنجھلا گیا۔ ”کمپٹرولر کے زیدید مجھے کب آرام کرنے دیں گے وہ تو مجھے قبر میں بھی چین نہیں لینے دیں گے۔ آج ریٹائرمنٹ ملے ہوئے تین سال ہو گئے، ظالموں نے ابھی تک میرے جی پی فنڈ اور پنشن کا حساب نہیں کیا۔ میں اپنی ملازمت کے دوران اتنا پریشان نہیں ہوا جتنا ان تین سالوں میں ہوا ——— دو سال ضروری کاغذات کی خانہ پری میں لگ گئے تیسرے سال بھی یہ چکر ختم نہیں ہوا۔ روزانہ یہی دلاسہ دیتے ہیں کہ تمہارا فائل جوہر آباد گیا ہوا ہے۔ وہاں سے آتے ہی تمہارے جی پی فنڈ کا حساب کر دیا جائے گا۔“ بڑے میاں سانس لینے کے لئے رُکے۔ میں نے فوراً پوچھا پھر کیا ہوا۔؟

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ”پھر کیا ہوا۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ ایک ہفتہ قبل مجھ سے کہا گیا کہ تمہارے فائل میں سے ایک ضروری کاغذ کہیں گم ہو گیا۔ آج اس کی کاپی کرا کر دوبارہ جمع کرانے آیا ہوں۔ خدا معلوم ابھی بدنصیبی کے اور کتنے دن دیکھنے ہیں۔ گھر میں فاقوں کی نوبت پہنچ گئی ہے۔“

کمپٹرولر کا ایک چپراسی بھی اس جگہ کھڑا ہوا علی نواز کی دُکھ بھری داستان سن رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے بڑے میاں کو سہارا دیکر زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بابا اس ملک کا سارا کاروبار رشوت پر چل رہا ہے۔ بابو کی مٹھی گرم کردو تمہیں جی پی فنڈ کا روپیہ ایک ہفتے میں مل جائے گا۔“

علی نواز جب کمرے میں جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”بابا تم کیا کرتے تھے۔؟“

علی نواز نے جواب دیا ”چپراسی تھا۔ ترقی ملی تو دفتری بن گیا۔ اور دفتری کی حیثیت سے ریٹائر ہو گیا۔ تقسیم سے قبل بھی میں دہلی میں محکمہ ٹیلی فون و ٹیلیگراف میں تھا۔“

اس واقعہ کے بعد بھی اکثر و بیشتر کمپٹرولر آفس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ علی نواز چپراسی سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ شاید اس نے کمپٹرولر کے چپراسی کے مشورے پر عمل کر کے اپنے دکھوں کے دن تھوڑے کر لئے تھے۔

کمپٹرولر سندھ کراچی کی بدعنوانیوں کا شکار عیوض علی خان کی داستان علی نواز سے کہیں زیادہ لرزہ خیز ہے۔ محکمہ صحت حکومتِ سندھ میں بی، سی، جی ٹیکنیشن تھا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء میں اسے ریٹائرمنٹ ملا۔ وہ تین سال سے اپنے پنشن اور جی پی فنڈ کے حصول کے لئے دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ تاحال اس کی مُراد پوری نہ ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ آسمان سے تارے توڑنا ممکن ہے، کوہ ہمالیہ سر کرنا شاید کوئی ایسی مشکل بات نہ ہو، لیکن ملازمت کے دوران اپنے خون سے جمع کیا ہوا روپیہ حاصل کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ اس نے اپنی بھاگ دوڑ اور مشکلات کی جو داستان روانہ کی ہے، اس کی تفصیلات یہ ہیں۔

عیوض علی خان ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء میں سبکدوش کیا گیا۔ پروونشل ٹی بی کنٹرول افسر، ہیلتھ ڈائریکٹوریٹ حیدرآباد نے اس کے جی پی فنڈ کے حساب ۱۹۷۰ء کے آخر میں تصدیق کر کے کمپٹرولر سندھ کو بھیج دیا تھا۔ اس کا فائل مہینوں کمپٹرولر کے دفتر میں پڑا سڑتا رہا۔ یاددہانی کے لئے اس کے محکمہ نے بے شمار ریمائنڈر اور ڈی پی روانہ کئے۔ لیکن کمپٹرولر کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ تقریباً ایک سال کے بعد مذکورہ محکمہ سے اسے جواب ملا، جس میں اُسے ”مژدہ“ سنایا گیا کہ تمہارے جی پی فنڈ کا حساب کہیں گم ہو گیا۔ دوبارہ بھیجا جائے۔ اس جواب پر دوبارہ حساب بھیجا گیا۔ چند ماہ کی خاموشی کے بعد جب دوبارہ جواب آیا تو اس میں بھی یہی لکھا ہوا تھا کہ تمہارا حساب دوبارہ گم ہو گیا۔ لہٰذا اپنے جی پی فنڈ کا مکمل ریکارڈ دوبارہ بھیجو۔“ اس طرح کم و بیش پانچ دفعہ عیوض علی خان کے جی پی فنڈ کا حساب گم کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ مذکورہ ملازم کا کوئٹہ اور بلوچستان کے

دفتر میں جی پی فنڈ کا جو حساب موجود تھا، اسے بھی کمپٹرولر سندھ والوں نے گم یا غائب کردیا۔

اب آیئے — عوض علی خان کی زبانی اسکی داستان کا بقیہ حصہ سنیئے۔

"میری تنخواہ سے جی پی فنڈ ہر ماہ جبری طور پر یہ کہہ کر کاٹا جاتا رہا کہ آڑے وقت میں کام آئے گا۔ لیکن تین سال کی طویل مدت گزرنے کے بعد بھی میرا "خون" واپس نہیں کیا جارہا ہے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جب تک ہو سکا قرض لے کر کام چلایا۔ لیکن اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔ قرض اس امید پر لیتا رہا کہ جی پی فنڈ اور گریجویٹی ملے گی تو سارا قرض ادا کردوں گا۔ قرض دینے والے بھی اسی امید پر مجھے قرض دیتے رہے۔ معمر اور کمزور ہوں۔ اس عمر میں بھی عزت کی روٹی کے لئے کسی کام کی تلاش کرتا رہا۔ لیکن کوشش کے باوجود مجھے کوئی کام نہیں ملا۔ اکثر لوگ مجھے دیکھ کر کہتے "بڑے میاں اس عمر میں تم کیا کام کروگے۔ جاؤ جا کر آرام کرو"۔

میرے بچے فاقوں سے نڈھال ہوچکے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں ہے۔ گرانی کا حال تو سب ہی جانتے ہیں۔ بھوک، افلاس، بیروزگاری سے تنگ آکر انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ بچوں کو بھوک سے بلکتا چہرہ اور پردہ نشین عورتوں کے تن کی عریانی دیکھنے کی اب مزید ہمت نہیں رہی۔ لہٰذا اس عرضداشت کے ذریعہ حکومتِ سندھ کو مطلع کرتا ہوں کہ ازراہِ خدا ترسی مجھ پر اور میرے بچوں پر رحم کیا جائے۔ میرے پنشن اور گریجویٹی کے فیصلے میں مزید تاخیر میری موت یا رسوائی کا سبب بن سکتی ہے۔

کمپٹرولر سندھ کراچی کے ایک کلرک نے ایک اور واقعہ کا انکشاف کیا۔ فقیر محمد اپر ڈویژن کلرک تھا۔ ساری زندگی سرکاری محکمہ میں جوتیاں گھسیٹتا رہا۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر بھی جی پی فنڈ میں رقم جمع کرواتا رہا۔ جب ملازمت سے ریٹائر ہوا تو بڑا پرامید تھا۔ اپنے دوستوں سے کہتا تھا "پنشن اور جی پی فنڈ کی رقم ملے گی تو کوئی چھوٹی سی دکان کروں گا۔ بقیہ زندگی آرام سے نہیں تو کم از کم عزت سے گزاروں گا۔" لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ چار سال تک کمپٹرولر سندھ کے دفتر کے چکر کاٹتا رہا۔ ہر بار اس سے یہی کہا جاتا رہا کہ "فلاں کاغذ کی کمی رہ گئی۔ فلاں سلپ گم ہوگئی۔ اکاؤنٹ نہیں ملتا۔ ٹوٹل میں کمی رہ گئی۔" اس طرح چار سال کا عرصہ وہ بے چارہ قرض کے سہارے اپنی گاڑی چلاتا رہا۔ اس دوران اس نے جی پی فنڈ کے حصول کے لئے کیا

کمپٹرولر آفس میں رشوت کا بازار گرم ہے

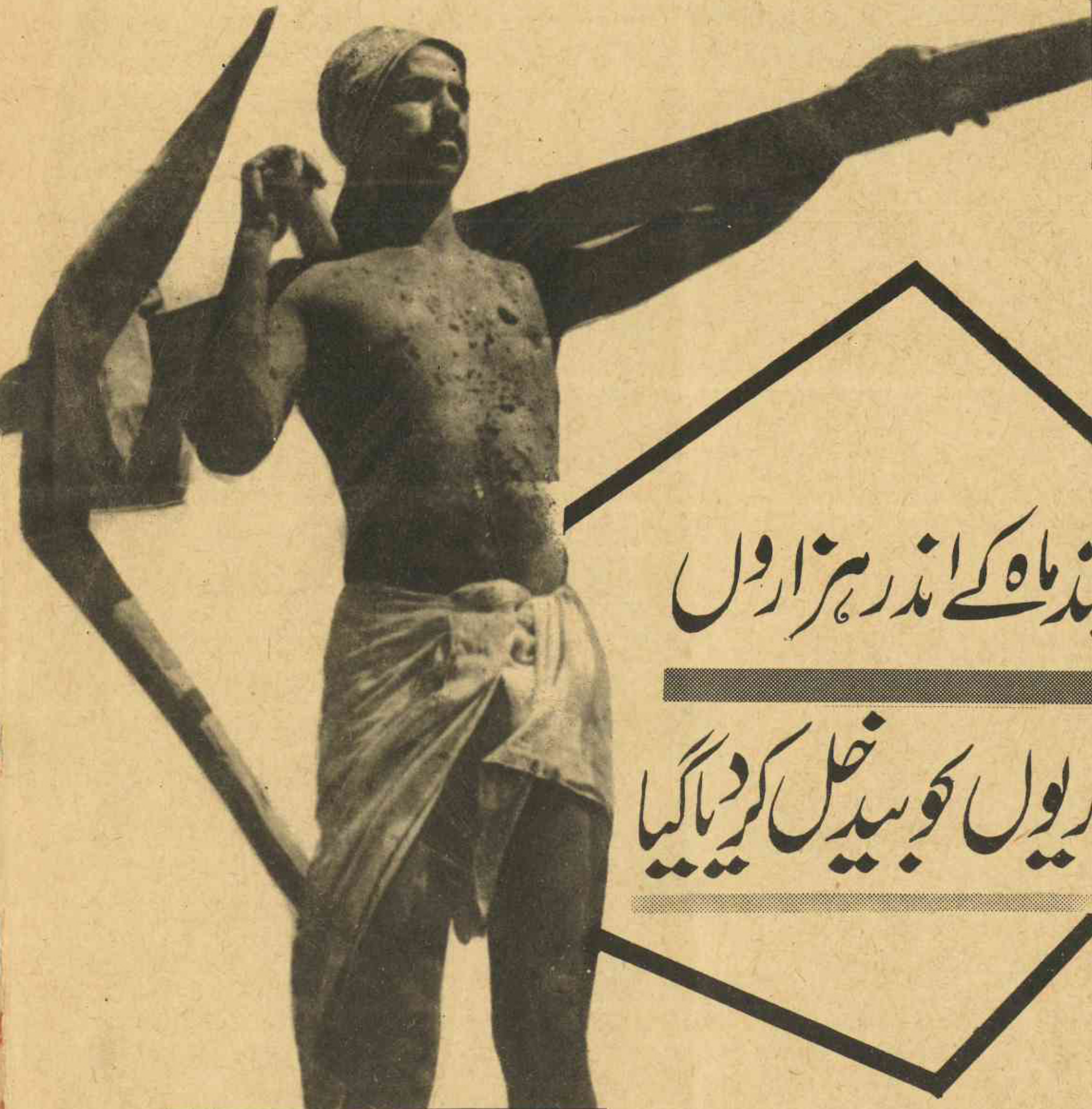
کچھ نہیں کیا۔ ہاتھ جوڑے، کلرکوں کے قدموں میں گر کر گڑگڑایا۔ لیکن اس کا کام نہیں بنا۔ اسی غم میں وہ بیمار پڑ گیا۔ اور پھر یہ بیماری اس کی جان لے کر چھوٹی۔ چالیسویں کے روز کمپٹرولر سندھ سے ایک مراسلہ موصول ہوا، جس میں مرحوم کو "ہدایت" کی گئی تھی کہ وہ جلد از جلد کمپٹرولر سے اپنا جی پی فنڈ اور گریجویٹی وصول کرلے"۔

اس سلسلے میں جب کمپٹرولر سندھ کے ایک ذمہ دار افسر سے بات چیت کی تو انہوں نے افسردہ لہجے میں بتایا کہ تمام سرکاری دفاتر کا ایک ہی حال ہے۔ خصوصاً کمپٹرولر سندھ کی کارکردگی تو انتہائی قابلِ رحم ہوچکی ہے۔ سب سے اہم شعبہ جی پی فنڈ ہے۔ جس کی کارکردگی کی مثال ہونی چاہیئے تھی، اپنی بے قاعدگی اور بے ضابطگی کے سبب سبکدوش ہونے والے ملازمین کے لئے دردِ سر بن گیا ہے۔ بیشتر ملازمین کے ریکارڈ موجود نہیں ہیں۔ بیلنس شیٹوں میں اندراج مکمل نہیں ہیں۔ حالانکہ ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے باقاعدہ جی پی فنڈ کے حساب میں رقم کٹتی ہے، اور متعلقہ ملازمین کے محکمے باقاعدگی سے لے جی پی اگر، اور کمپٹرولر سندھ کو ماہ بہ ماہ اس کی تحریری اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود جی پی فنڈ کے رجسٹر میں کٹوتی کا حساب باقاعدہ درج نہیں کیا جاتا۔ جس کے نتیجے میں جب کوئی ملازم ریٹائر کیا جاتا ہے تو اسے اچانک اطلاع دی جاتی ہے کہ اس کا حساب مکمل نہیں ہے۔ فلاں فلاں ماہ کی رقم کا حساب گم ہوگیا ہے، لہٰذا فوری طور پر جمع کراؤ۔ یہ صورتِ حال ملازمین کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ کمپٹرولر کے افسران اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے۔ نااہل لوگوں کی پوری فوج بھرتی کردی گئی ہے۔ وہ اپنا بیشتر وقت گپ شپ ہنسی مذاق، بحث و مباحثہ اور چائے نوشی میں گزارتے ہیں۔ سرکاری کام مشکل سے گھنٹہ دو گھنٹے ہوتا ہے۔ بقیہ سارا وقت فضول باتوں میں ضائع کردیا جاتا ہے۔ اگر آپ اچانک تمام شعبوں کو چیک کریں تو اکثر حضرات اپنی سیٹوں سے غائب ملیں گے۔ فائلوں پر گرد جمی ہوگی۔ ریکارڈ مکمل نہ ہوں گے۔ کاغذات میزوں پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوں گے۔ بڑا عجیب و غریب منظر ہوتا ہے۔

انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ کمپٹرولر سندھ کے بیشتر ملازمین دوسری جگہ کام کرتے ہیں۔ اس میں کم تنخواہ والے ملازمین کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ سرکاری اسکیل اتنے ناقص ہیں کہ کلرکوں اور چپراسیوں کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ خیر یہ لوگ تو کسی حد تک قابلِ معافی ہیں، لیکن بڑی تنخواہ پانے والے افسران سرکاری کاموں پر پوری طرح توجہ دینے کی بجائے اپنے پرائیوٹ کاموں پر زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ کمپٹرولر سندھ میں رشوت کا بھی بازار گرم رہتا ہے۔ تین چار شعبے تو اس معاملے میں بری طرح بدنام ہیں۔ لیکن اتنے اہم محکمے کی اصلاح کی جانب آج تک سنجیدگی سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

چوٹ چوٹی کرے
پکڑا جائے ہاری

الفتح رپورٹ



چند ماہ کے اندر ہزاروں ہاریوں کو بیدخل کر دیا گیا

اندرونِ سندھ میں دو قسم کی سرگرمیاں عام ہیں، اوّل جرائم کی بھرمار دوئم ہاریوں کی بیدخلیاں۔ دونوں میں ہاریوں کا سراسر نقصان اور وڈیروں کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جرائم پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اب ان کی تعداد میں جہاں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے، وہاں ان کی نوعیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔

بیدخلیوں سے قبل جرائم کی نوعیت سن لیجیے۔ گاؤں اور گوٹھوں میں چوری چکاری کی وارداتیں بڑھ گئی ہیں۔ اس قسم کی اگر کوئی واردات ہوتی ہے تو پولیس چوروں کو گرفتار کرنے کی بجائے وڈیرے کے مخالفین کو دھر لیتی ہے۔ تھانیدار واردات کی تفتیش نہیں کرتا، بلکہ اس کی خبر سن کر وڈیرے کی ڈیوڑھی پر پہنچتا ہے۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے، "سرکار آپ حکم دیں کس ہاری کو اس الزام میں پکڑا جائے"۔ وڈیرہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے حکم دیتا ہے۔ "جاؤ فلاں ہاری کو پکڑ لو، اس نے مجھے سلام نہیں کیا تھا"

جی ہاں، چوری کے الزام میں اس ہاری کو گرفتار کر لیا جاتا ہے، جو اسے سلام نہیں کرتا۔ ان ہاریوں کو بھی مختلف بے بنیاد الزامات میں گرفتار کر لیا جاتا ہے جو وڈیرے کے احکامات کے سامنے اپنا سر جھکانے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ایک حالیہ سروے کے مطابق اندرونِ سندھ میں اس نوعیت کی بیشتر چوریوں، ڈکیتیوں اور قتل وخون کے واقعات کے پیچھے وڈیروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس بے گناہ ہاریوں کو چوری اور دوسرے جھوٹے الزام میں گرفتار کر کے ان سے سینکڑوں روپے وصول کرتی ہے۔ بے چارے ہاری اپنا گھر بار، ہل بیل اور کل اثاثہ فروخت کر کے پولیس کی جھولی بھرتے ہیں۔ اور خود بے گناہی کی سزا در در کی خاک چھان کر بھگتے ہیں۔ ہاری جب اس ظلم

پولیس جاگیردار کو سلام نہ کرنے والے ہاری کو پکڑ لیتی ہے۔!!

کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو پولیس کی جانب سے اعلان کیا جاتا ہے کہ مجرموں کے خلاف پورے سندھ میں مؤثر مہم شروع کی جانے والی ہے۔ اس کے بعد باقاعدہ مہم بھی چلائی جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی مہم کے دوران عموماً جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کرنے کی بجائے ان بے گناہوں کو پکڑ لیا جاتا ہے جن کے کھاتے میں وڈیروں کی حکم عدولی کا قصور درج ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کی گرفتاریوں کی تحقیقات کی جائے تو بیشتر گرفتاریاں انتقامی کارروائیوں کا نتیجہ نکلیں گی۔

خیر یہ تو جرائم کی چند ایک مثالیں ہیں۔ اب آیئے ہاریوں کی بیدخلیوں کے بارے میں کچھ معلوم کریں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سرکاری ہیں، جو جون ۱۹۷۳ء میں صوبائی اسمبلی میں وقفہ سوالات کے دوران پیش کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ بیدخلی کے ایسے سینکڑوں واقعات کے ریکارڈ اس لئے موجود نہیں ہیں کہ ہاری زمین سے بیدخل ہونے کے بعد معاشی طور پر اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ اس رپورٹ میں حیدرآباد، تھرپارکر کی بیدخلیوں کے اعداد و شمار شامل نہیں ہیں۔

ضلع	تحصیل	تعداد
سانگھڑ	۱- کھپرو	۴۷
〃	۲- سنجھورو	۷۱
〃	۳- شہداد پور	۱۲۳
〃	۴- سانگھڑ	۲۳۹
		۴۷۸
جیکب آباد	۱- گڑھی خیرو	۱۰
〃	۲- ٹھل	۱۷
〃	۳- کندھ کوٹ	۱۸
〃	۴- کشمور	۱۷
		۶۲
لاڑکانہ	۱- واہ	۵
〃	۲- ڈوکری	۱۹
		۲۴
ٹھٹھہ	۱- سجاول	۵۹
نواب شاہ	۱- کنڈیارو	۷۹
〃	۲- نوشہرو فیروز	۲۴
〃	۳- مورو	۸۰
〃	۴- سکرنڈ	۶۹
〃	۵- نواب شاہ	۳۵
		۲۸۷
دادو	۱- دادو	۲۵
〃	۲- خیرپور ناتھن شاہ	۶۳
〃	۳- جوہی	۱۳۳
〃	۴- سیہون	۲۷
〃	۵- کوٹڑی	۳۸
〃	۶- میہڑ	۷
		۲۹۳
سکھر	۱- اوباڑو	۱۱
〃	۲- شکارپور	۱۹
〃	۳- گڑھی یاسین	۳۵
〃	۴- روہڑی	۶
〃	۵- سکھر	۳
〃	۶- پنو عاقل	۳
		۹۹
خیرپور	۱- نارو	۱۷

اگر سرکاری اعداد و شمار ہی کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سندھ کے صرف چند اضلاع اور تحصیل میں چند ماہ کے اندر اندر ہزاروں بے گناہ ہاریوں کو بے دخل کر کے وڈیروں اور جاگیرداروں نے ان سے انتقام لینے کی قسم پوری کر دی۔ انہوں نے انہی ہاریوں کو پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے پر دھمکی دی تھی کہ "اگر پیپلز پارٹی کی حکومت ہوگی جب بھی تم محکوم ہی رہو گے۔ اور ہم آقا کے رُتبے پر رہیں گے۔ ہم سے بغاوت کا راستہ رسوائی، ذلت اور موت پر ختم ہوگا۔" ان کی یہ دھمکی لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوئی۔ ہاریوں نے جس پارٹی کی حمایت کی تھی اس کے دورِ اقتدار میں خوش حالی اور سکون کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن جب ان کی پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو انکے خواب کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ وڈیروں کے ظلم و تشدد کے شکار ہیں۔ بیدخلیوں کے موجودہ ریکارڈ نے سابقہ تمام ریکارڈوں کو مات کر دیا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جن لوگوں نے ہاریوں کو سنہرے خواب دکھائے تھے، نئی زندگی اور نئے سماج کا پیغام دیا تھا، آج وہی ان کے حالات سے بے خبر ہیں بلکہ یہ لوگ ان وڈیروں کا ساتھ دے رہے ہیں جو کبھی پیپلز پارٹی کے بدترین دشمن تھے۔

ارہر کا کھیت

رشید احمد صدیقی



"وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"

دیہات

ہیں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں نمٹ آتے ہیں، ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلروں کی ہیر ہیرا ور چیرز جواب "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصوّر کی جاتی ہیں وہ صدائے باز گشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آدہ بکر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واٹر لو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچّوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچّے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک قضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا "نان کوآپریشن"۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں کہر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے، کتّے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا۔ سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلے میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی اور دوسرے دن کی مشقت خوش آئند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے، کسان

دیہاتی عورت کو مایۂ عزت

سمجھاتے اور شہری آلۂ تفریح ——!!

کی بیوی، اس کے بچے بچیاں اور اس کا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لئے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لئے، کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس لئے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں، غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آج کل کے روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی۔!

لیکن وہ دیکھیے گا، گاؤں کے قریب والے کنوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے، جیسے کوئی کہن سال وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ جس پر ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں، جیسے جنگِ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندانِ قسمت شاخِ زریں پر بیٹھے ہوتے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتوں کی کچھ تعداد جمع ہوئی۔ یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں، پُر شباب لیکن بے خطر کنوئیں کی جگت پر تھیں، پاؤں لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی اور بوڑھیوں کو دعوتِ تہدید و عتاب دیتی ہوئی کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں، گالیاں دے رہی تھیں، اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آپہنچا، نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی و طراری سے اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اکہری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے یہ مجمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہولیا۔ جسموں کو تولتے ہوئے نوجوان عورتیں لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسم، پاس کا لڑکا، لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی۔ یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک، ناقابلِ گذار، اندیشہ ناک اور خاردار سدِ روئیں کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

برسوں گذرے ہیں اسی دشت کی سیّاحی میں
لیکن بعض تقات جس کا شاید نام لیتے سے گھبرائیں۔

ارہر کا کھیت۔!

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لئے ہم جوُرن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کا "آرام جاں" اور "مونسِ قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لئے افتاں و خیزاں یہاں تک پہنچا ہے اور کسی سے وعدۂ دید و انذ کے مرید کا قول و قرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے اور —— کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آپہنچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں

> کسان کتنا ہی فلاکت زدہ
> کیوں نہ ہو وہ آج کل کے
> روشن خیال میاں بیویوں سے
> زیادہ خوش قسمت ہے

ماسکوریڈیا جشن "نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں یا گالیاں دیتے ہیں، ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے۔ مہابھارت یا ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے، سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے۔ ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانے میں ورنہ جیل خانے میں۔ جیل خانے کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گذرتے ہیں۔ اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اس کے نوجوانوں نے اسرافِ شباب کے لئے شفاخانوں کو جیل خانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار اپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیل خانہ کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفاخانہ سے زندگی اور جیل خانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا کہ مرچ اور تمباکو مضرِ صحت ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے۔ لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالاتِ منتظرہ ہیں، ایک کا مقصود انتظار "دشمن ایمان و آگہی" یا "رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا۔؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے۔ تو گاؤں والے بسولہ سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے۔ کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں

کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا۔

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الّا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حیّ و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الّا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزّت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکشِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنّن جس کے لئے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی زن اور آرام چاہتا ہے، شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے۔ آج چوپاٹی اور اپالو دریا بُرد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی اور اپالو تعمیر کر لے گا۔ کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر! چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے، یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کو دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں، جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے، مہابھارت یا ارہر کا کھیت

ہوا اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

اندھیرے میں گالی گلوچ موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسری کا ہاتھ، بعوقِ حفظانِ صحت پر پڑا اور پڑتے ہی غصّہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا۔ دونوں یک لخت اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ منیا کے لڑکے مکندیا کا فعل تھا۔ دونوں نے مکندیا کو بہ بانگِ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلانِ جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا۔ مکندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقینِ اوّل میں سے کسی کے اوپر جا گرا، دونوں چیخ پڑیں۔ منیا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ خشک طہارت کا خیال رہا نہ ترنجاست کا، ایک غوغا بلند ہوا، بھگدڑ مچ گئی، کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد، عورت، بچّے، گیدڑ، کتّے، بٹیریں، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ ——— گویا اسمبلی میں بم گرا۔

جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتّا سامنے سے گزرا اور ہم نے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادۂ نقضِ امن ہوئے گویا اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتّوں کے استیصال کے لئے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گزرا اور ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا۔ کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہو گی۔ اس نے نہایت انکسار اور متشکرانہ انداز میں حامی بھری۔ ابھی یہ رسمی تکلّفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آگیا، بولا، میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے، دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا۔ (خوانچہ کے اندر جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے۔ یہ لیجئے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکامِ یونیورسٹی نے معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصّہ اور سکوت، خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے "حاجی بلغ العلےٰ" کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ ع عالمِ تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلےٰ" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے، کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور حال "ابوالمجنونؔ" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خشت البزایہ" پر زور لگاتے رہے ان

ارھر کا کھیت — دیہاتیوں کی اسمبلی

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرضِ بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے۔ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے، پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنائے ہیں۔ رکمینا کے بچّہ کیوں نہیں پیدا ہوتا اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا، ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہو گی، دوسری بولی بہلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھڑا ہو گا۔ اس پر اختلاف آرا

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقرّرہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لیکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا۔ پانے والوں کے لئے اتنا ہی بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی آثارِ قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچہ ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اس گزر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہارِ خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو

دنوں "قانونِ مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے، جلدی سناؤ جلدی، میں نے کہا کیا۔ فرمایا کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا سنیئے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

باقی صفحہ ۲۰ پر

صحافت پر پابندیاں • اختر رحمان

پریس پر پابندیوں کی دو شکلیں ہیں۔ ایک چھاپہ خانہ قائم کرنے، اسے چلانے اخبار جاری کرنے اور اسے چھاپنے کے حق پر پابندی۔ دوسرے چھاپہ خانوں اور اخبارات کا احتساب کرنے کے لئے خاص قوانین کا نفاذ۔

مروّجہ پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس کے تحت کوئی شخص بغیر ڈیکلریشن حاصل کئے نہ چھاپہ خانہ قائم کر سکتا ہے، نہ اخبار جاری رکھ سکتا ہے۔ ہم اس پابندی کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اسے جائز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ لفظ ڈیکلریشن کے معنی ہیں اعلان۔ ڈیکلریشن دیئے جانے کا تصور ہی غلط ہے۔

چھاپہ خانہ صنعت میں شامل کیجئے یا کاروبار میں، اس کے لئے اجازت نامے کی کڑی شرائط کیوں ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض صنعتی اور کاروباری اداروں کے لئے اجازت نامے کی کڑی شرائط رکھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بارود خانہ، شراب خانہ، افیون کا ٹھیکہ، سینما وغیرہ۔ ان میں بعض کاروبار

"خطرناک" سمجھے جاتے ہیں اور بعض اخ
چھاپہ خانہ کس زمرے میں آتا ہے؟ شاید

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قو

چھاپہ خانوں پر پابندیاں اس بر
کی یادگار ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکو
میں جن اداروں کو اپنے مفادات کے مناف
چھاپہ خانہ بھی تھا۔ کیونکہ اس میں ایسی کتا
اخبارات کے چھپنے کا اندیشہ تھا جن میں کم
آزادی کے "جرم" کی ترغیب دی ج

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ڈیکلریشن

بنیاد کا خوف



قیام پاکستان کے بعد ملک کی سیاست کا پہلا اصول یہ ٹھہ
حکومت کے معنی ہے ریاست اور حکومت پر تنقید ملک سے بغ
اور دوسرا اصول یہ کہ قوم کی طبقاتی تقسیم نہایت جائز ہے۔ اس
کی بدعنوانیوں پر تنقید اور غرباء کے حقوق کی وکالت ملک
غداری کے مترادف ہے

انگریز کے دور میں اخبار نکالنے کے لئے ڈیکلریشن داخل کرنا کافی تھا

صدی کے اوائل میں ہی ایک قانون نافذ کیا گیا جس کے تحت کوئی فرد لائسنس حاصل کئے بغیر نہ چھاپہ خانہ قائم کر سکتا تھا نہ استعمال کر سکتا تھا۔ ۱۸۶۷ء تک یہ پابندی برطانوی مفادات کے مطابق کبھی نرم اور کبھی سخت ہوتی رہی۔ تب ۱۸۶۷ء میں وہ قانون نافذ کیا گیا جو ۱۹۶۰ء تک رائج رہا۔ اس قانون میں چھاپہ خانہ کی ملکیت کے متعلق صرف یہ شق تھی۔

"کوئی ایسا شخص ملک میں اپنے قبضے میں چھاپہ خانہ نہیں رکھے گا جس نے اپنے علاقے کے مجسٹریٹ کے رُو برُو یہ اعلان نامہ داخل نہ کیا ہو کہ "منکہ فلاں اقرار کرتا ہوں کہ میری تحویل میں ایک چھاپہ خانہ ہے، جو۔ (مقام کی وضاحت) پر واقع ہے"۔

اس ایکٹ میں کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس کے تحت مجسٹریٹ متعلقہ یا حکومت چھاپہ خانہ قائم کرنے یا چلانے کے اقرار نامے کو نامنظور کر دے یا ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دے۔

دورِ غلامی کے اس قانون میں چھاپہ خانہ قائم کرنے اور چلانے کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ البتہ ڈیکلریشن کی شرط کا مقصد یہ تھا کہ حکام کے پاس ہر چھاپہ خانہ کا مکمل پتہ موجود ہے تاکہ اگر کہیں کوئی چھپا ہوا قابلِ اعتراض مواد پایا جائے تو چھاپہ خانہ کی معرفت معلوم کیا جا سکے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ لیکن غیر ملکی حکمران زیادہ عرصے تک اس فراخدلانہ قانون کے پابند نہیں رہے۔ جب بھی آزادی کی تحریک اُبھرتی تھی چھاپہ خانوں پر عارضی پابندیاں لگا دیتے تھے۔ تا آنکہ ۱۹۳۱ء میں پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ نافذ کیا گیا۔ یہ ایکٹ بھی ۱۹۶۰ء تک نافذ رہا۔ اور اس میں چھاپہ خانہ چلانے کے حق پر ضمانت نامے کی پابندی عائد کر دی گئی۔

اس پابندی کا مفہوم یہ تھا (دفعہ ۳۔ ایکٹ ۱۹۳۱ء) کہ چھاپہ خانہ کے مالک کے ڈیکلریشن داخل کرنے کے دس دن کے اندر اندر مجسٹریٹ اگر چاہے تو وجوہات تحریر میں لا کر ڈیکلریشن داخل کرنے والے سے ایک ہزار روپیہ بطورِ ضمانت طلب کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود ڈیکلریشن اقرار نامہ ہی رہا، لائسنس نہیں بنا۔ حکام کو یہ اختیار نہیں ملا کہ وہ ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دیں۔ یہ ضرور ہے کہ چھاپے خانے بند کرنے کے لئے حکومت دوسرے خاص قوانین کا سہارا لیتی رہی۔

۱۹۶۰ء میں پاکستان کا پہلا "جامع" قانون پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس نافذ کیا گیا۔ اس میں بھی چھاپہ خانے کی حد تک ڈیکلریشن کی شرائط بہت سخت نہیں تھیں۔ چھاپہ خانے کے ڈیکلریشن کی ۱۸۶۷ء کے ایکٹ کی مذکورہ بالا دفعہ میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا۔

"جب بھی چھاپہ خانے کی جائے وقوع میں تبدیلی ہو، نیا ڈیکلریشن داخل کرنا لازم ہوگا۔ بشرطیکہ یہ تبدیلی ۶۰ دن سے کم مدّت کے لیے ہو، اور وہ جگہ جہاں چھاپہ خانہ منتقل کیا گیا ہو اسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے علاقہ اختیار میں ہو جس کے سامنے پہلا اقرار نامہ داخل کیا گیا تھا، اور چھاپہ خانے کا مُنصرم وہی رہے۔ اور منتقلی کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس تبدیلی کی اطلاع ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دیدی جائے"۔

یہ قانون ہماری تاریخ کے کالے قوانین میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں چھاپہ خانہ بند کرنے کے وسیع اختیارات انتظامیہ کو دے دیئے گئے تھے۔ لیکن چھاپہ خانے کا ڈیکلریشن نامنظور کرنے کا اختیار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو نہیں تھا۔ اور ۱۹۳۱ء کے ایکٹ کی وہ شق جس کے تحت چھاپہ خانے کے مالک کو ڈیکلریشن کے ساتھ زرِ ضمانت جمع کرانے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ وہ بھی قانون میں شامل نہیں تھی۔

۱۹۶۲ء کے آئین کے نفاذ کے بعد چھاپہ خانے اور اخبارات کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صوبائی حکومت کو دیدیا گیا۔ ۱۹۶۰ء کے قانون میں پہلی ترمیم ایک آرڈی ننس کے ذریعے ستمبر ۱۹۶۳ء میں کی گئی۔ چھاپہ خانوں کے ڈیکلریشن کے بارے میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ ایک مہینے کے بعد یعنی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس جاری کیا گیا، جو آج تک نافذ ہے۔ اس میں بھی چھاپہ خانے کے ڈیکلریشن فائل کرنے کی شرط جوں کی توں قائم رہی۔

۱۹۶۶ء میں اس قانون میں انتہائی قابلِ اعتراض شرائط کا اضافہ کیا گیا۔ مغربی پاکستان کے آرڈیننس نمبر ۳ مجریہ ۱۹۶۶ء کے تحت پہلی مرتبہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ۔

چھاپہ خانے کے لئے ڈیکلریشن داخل کرنا کافی نہیں بلکہ اس کی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے تصدیق ضروری ہے۔ گویا اقرار نامہ اجازت نامے میں تبدیل ہو گیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اس وقت تک ڈیکلریشن پر ہرگز دستخط نہیں کرے گا جب تک اس امر کا اطمینان نہ کر لے کہ۔

(الف) مجوزہ نام کا پریس صوبے میں پہلے سے قائم نہیں۔

(ب) ڈیکلریشن داخل کرنے والے کو گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں اخلاقی جرم کی سزا نہیں بھگتنا پڑی۔

انصاف کا تقاضہ ہے کہ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس منسوخ کیا جائے

(ج) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کسی ایسے پرنٹر کے ڈیکلریشن کی تصدیق ہرگز نہیں کرے گا جس کے بارے میں حکومت کو یقین ہو (ایسی اطلاع کی بنیاد پر جو اس کے قبضے میں ہو) کہ اس کا عمل پاکستان کے دفاع یا خارجہ تعلقات یا تحفظ کے منافی ہوگا۔ یا وہ چھاپہ خانہ قابلِ دست اندازی، تشدد آمیز جُرم کی ترغیب یا رسوا کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔ البتہ ڈیکلریشن "نا منظور" کرنے سے پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شخصِ متعلقہ کو اپنی صفائی اور شہادت پیش کرنے کا موقع دیگا اور ایسے حکم کے خلاف شخصِ متعلقہ حکومتِ مغربی پاکستان کے پاس فریاد کر سکے گا، اور حکومت چاہے تو اس حکم میں تبدیلی کردے۔ یا اس کی توثیق کردے، یا اسے منسوخ کردے۔ (لیکن ایسا کرتے ہوئے حکومت کسی ضابطے کی پابندی نہیں)

اس طرح اب چھاپہ خانے کے لئے ڈیکلریشن داخل کرنا کافی نہیں۔ بلکہ مالک کو ڈیکلریشن حاصل کرنا پڑتا ہے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چاہے تو اجازت نامہ برسوں تک نہ دے۔ وہ کسی معیاد کا پابند نہیں۔ چنانچہ ایوب خان کے دور میں اس کامل اختیار کے اس استعمال کی حیرت انگیز مثالیں سامنے آئیں۔

مثال کے طور پر زید چھاپہ خانہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ پہلے چھاپہ خانہ خریدے اور قیمتِ خرید کی رسید ڈیکلریشن کے ساتھ داخل کرے۔ پھر انتظار کرے کہ کب اجازت نامہ ملتا ہے۔ یہ بھی ہوا کہ چھاپہ خانہ خرید لیا گیا اور مدت تک استعمال نہیں ہو سکا کیونکہ اجازت نامہ نہیں ملا۔ اگر چھاپہ خانے کا مالک مرجائے تو اس کے ورثا متوفی کی جائداد کے حقدار، زمین کے حقدار، کارخانے کے حقدار لیکن چھاپہ خانہ کے ڈیکلریشن کے لازمی طور پر مستحق نہیں۔ وہ ڈیکلریشن داخل کریں، اگر اجازت مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ چھٹی۔

کیا اس قسم کی پابندیاں کسی مہذب اور بنیادی حقوق کا احترام کرنیوالی سوسائٹی میں جائز قرار دی جاسکتی ہیں۔؟

اخبار کا ڈیکلریشن

اخبار شائع کرنے کے لئے ڈیکلریشن کی پابندیاں اور بھی سخت ہیں۔

۱۸۶۷ء کے ایکٹ (پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ میں اخبارات کے ڈیکلریشن کے متعلق یہ دفعات تھیں۔

۱۔ مندرجہ ذیل قواعد پورے کئے بغیر کوئی اخبار شائع نہیں کیا جائے گا۔

(الف) اخبار کی ہر کاپی پر ایڈیٹر کا نام بطور ایڈیٹر صاف چھاپہ جائے۔

(ب) اخبار کا طابع (پرنٹر) اور ناشر (پبلشر) اپنے متعلقہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے رُو برُو اصولتاً یا وکالتاً پیش ہو کر ایک ڈیکلریشن داخل کرے جس میں وہ اقرار کرے کہ وہ اخبار۔ نامی کا پرنٹر یا پبلشر یا پرنٹر اور پبلشر ہے اور یہ اخبار (فلاں جگہ) سے چھاپا یا شائع یا چھاپہ اور شائع کیا جاتا ہے۔

(ج) جب بھی مقامِ طباعت یا اشاعت میں تبدیلی ہو، نیا ڈیکلریشن لازمی ہوگا۔

(د) جب بھی پرنٹر یا پبلشر ملک سے باہر جائے گا، کسی نئے پرنٹر یا پبلشر کا ڈیکلریشن ضروری ہوگا۔

(ہ) البتہ کوئی نابالغ فرد ڈیکلریشن داخل کرنے یا اخبار کی ادارت کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

(ی) ڈیکلریشن کی دونوں کاپیوں پر مجسٹریٹ متعلقہ اپنے دستخط اور مہر ثبت کرکے ڈیکلریشن کی تصدیق (AUT-HENTICATION) لازمی کریگا۔ ان میں سے ایک کاپی مجسٹریٹ مذکور کے پاس رہے گی اور دوسری ہائی کورٹ کے پاس ریکارڈ میں۔

اس ایکٹ کی مندرجہ بالا دفعات اور بعد کی دفعات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قانون کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہر اخبار کی اشاعت اور اس میں شامل مواد کا کوئی نہ کوئی شخص ذمہ دار ضرور ہو۔ تاکہ اگر کوئی اخبار ایسا چھپے یا کسی اخبار میں ایسا مضمون یا خبر چھپ جائے جو ملک کے عام قوانین کے تحت قابلِ گرفت ہو تو حکام ذمہ دار افراد کی نشاندہی کرکے مواخذہ کر سکیں۔ اس ایکٹ میں کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس کی رُو سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا دوسرا با اختیار مجسٹریٹ ڈیکلریشن کی تصدیق سے انکار کرے۔

بالفاظِ دیگر اس قانون کے تحت ہر شخص کو ڈیکلریشن داخل کرنے کا حق حاصل تھا۔ ۱۹۳۱ء کے مذکورہ بالا ایکٹ میں بھی ڈیکلریشن کا حق قائم رہا۔ البتہ برطانوی حکمرانوں نے آزادی کی تحریک سے پریشان ہو کر یہ ترمیم کردی کہ اخبار کے ڈیکلریشن کے ساتھ ساتھ زرِ ضمانت طلب کی جاسکتی تھی۔ عام طور پر ڈیکلریشن داخل کرنے کے تھوڑے ہی دن بعد تصدیق کی کارروائی ہو جاتی تھی۔ خاص قوانین کے تحت حکومت زرِ ضمانت طلب کرکے یا اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کرکے اخبار کی اشاعت روک سکتی تھی، لیکن اخبار کا ڈیکلریشن نامنظور کرنا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیار میں نہ تھا۔ البتہ جنگ کے زمانے میں کچھ پابندی کاغذ کی قلت کے پیشِ نظر عائد کی گئی تھی۔

اچک زئی کا مقدمہ

پاکستان بننے کے بعد اخبارات کو ڈیکلریشن "دینے" سے انکار کیا گیا لیکن کارروائی سیکورٹی ایکٹ کے تحت کی جاتی تھی۔

نومبر ۱۹۵۷ء میں ایک مشہور مقدمہ پیش ہوا۔ صوبائی حکومت نے عبدالصمد خان اچک زئی کو تین جرائد کے لئے ڈیکلریشن دینے سے انکار کردیا۔ (سیکورٹی ایکٹ پاکستان ۱۹۵۲ء کے تحت) اچک زئی نے ہائی کورٹ میں دعویٰ کردیا۔ اور ہائی کورٹ نے حکومت کے فیصلے کو خلافِ قانون قرار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت نے پھر ایک اور دفعہ کے تحت اخبار چھاپنے کی اجازت نہیں دی لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ ڈیکلریشن نامنظور کرنے کے بارے میں حکومت کے اختیارات قانونی طور پر جائز نہیں تھے۔ ۵۸ء کے

نیوز پیپر اینڈ ایڈیٹرز کی مجلسِ قائمہ نے دبی زبان سے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ڈیکلریشن "دینے" کے معاملے میں حکومت کو بہت وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ اور ان کے ناجائز استعمال کا احتمال تھا۔

۱۹۶۳ء کے مغربی پاکستان (یعنی موجودہ) آرڈیننس میں ڈیکلریشن کی یہ شرائط جوں کی توں باقی رہیں۔ لیکن ۱۹۶۴ء کے ترمیمی آرڈیننس (نمبر ۲، مجریہ نومبر ۱۹۶۴ء) کے تحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ڈیکلریشن نامنظور کرنے کے اختیارات میں توسیع کر دی گئی۔ اس ترمیمی قانون کی رُو سے ڈیکلریشن کی نامنظوری کی وجوہاتِ بالا میں شق (سی) کی جگہ تین نئی شقیں نافذ کر دی گئیں۔ وہ یہ تھیں۔

۱۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کسی ایسے پرنٹر یا پبلشر کا ڈیکلریشن تصدیق کرنے سے انکار کر دیگا جس کے بارے میں اس اطلاع کے مطابق جو اس کے قبضے میں اور شخصِ متعلقہ کو صفائی کا موقع دینے کے بعد حکومت مطمئن ہو کہ وہ شخص کوئی ایسا کام کرے گا جو پاکستان کے دفاع یا امورِ خارجہ، یا ملک کے تحفظ یا مغربی پاکستان میں تحفظِ عامہ کے منافی ہو، یا اخبار کو قابلِ دست اندازی، تشدد آمیز جرم کی ترغیب دینے یا کسی کو رسوا کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔

۲۔ اس شق کے تحت ممانعت کا حکم جاری کرنے سے پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شخصِ متعلقہ کو صفائی اور ثبوت پیش کرنے کا موقع دے گا۔

۳۔ اس حکم کے خلاف حکومتِ مغربی پاکستان سے فریاد کی جا سکے گی اور حکومت چاہے تو اس حکم میں ترمیم کر دے، اسے منسوخ کر دے یا اسکی توثیق کر دے۔

۱۹۶۰ء کے آرڈیننس کے بعد حکم جاری کیا گیا کہ تمام اخبارات جن کے ڈیکلریشن ۱۸۶۷ء کے ایکٹ کے تحت داخل کئے گئے تھے وہ نئے سرے سے ڈیکلریشن فائل کریں۔ اور ظاہر ہے کہ نئے ڈیکلریشن فارموں پر نئے اختیارات کا استعمال ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ بہت سے جرائد اور بعض اخبارات کے ڈیکلریشن ۱۹۶۱ء کے اوائل میں منظور کر دیئے گئے۔

اس قانون کے تحت ایوب شاہی دور میں جو دھاندلیاں کی گئیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ انگریزی ہفت روزہ آؤٹ لک کا حشر معلوم ہے۔ سنگباد کے ڈیکلریشن میں معمولی ترمیم سے انکار کا قصہ بھی عوام کو معلوم ہے، لیکن کس طرح ڈیکلریشن دیا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ داستان بہت عبرت ناک ہے۔ اوّل تو قانون میں ڈیکلریشن کے تصدیق کی مدت مقرر نہ ہونے کی وجہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جواب ہی نہیں دیتے تھے۔ ڈیکلریشن فائل کرنے کے بعد سالہا سال تک لوگ انتظار کرتے رہتے تھے لیکن اس پر مجسٹریٹ کے دستخط نہیں ہوتے تھے۔ ضابطے کی کارروائی ملاحظہ ہو۔

زید نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ڈیکلریشن فائل کیا، اس کے ساتھ بنک گارنٹی لازمی (مالی وسائل کے ثبوت کے لئے) ایک حلف نامہ کہ فدوی سزا یافتہ نہیں، دوسرا بیان کہ ایڈیٹر معقول تعلیمی استعداد رکھتا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تین رپورٹیں طلب کرتا تھا۔ ایک ایس پی سے، ایک اسپیشل پولیس سے اور ایک علاقے کے ڈائریکٹر انفارمیشن سے۔ یہ رپورٹیں پولیس کے معمولی افسروں اور انفارمیشن کے کلرکوں سے شروع ہوتی تھیں۔ یہ حضرات بتلاتے تھے کہ درخواست دہندہ ترقی پسند ہے یا نہیں۔ وہ جرم کرے گا یا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کیا شرط پوری ہوئی ہے یا نہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی مرضی پر منحصر تھا۔ مزید یہ کہ مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو ناجائز ہدایات دے رکھی تھیں کہ کوئی ڈیکلریشن مرکزی وزارتِ اطلاعات کی مرضی کے بغیر نہ دیا جائے۔ مہینوں درخواست دہندہ کو یہ کہہ کر ٹال دیا جا سکتا تھا کہ فائل مرکز کے پاس سے نہیں آئی۔ ۱۹۶۸ء میں مرکزی حکومت نے ہدایات جاری کیں کہ کاغذ کی قلت ہے لہٰذا نئے ڈیکلریشن نہ دیئے جائیں۔ سب سے زیادہ ناانصافی یہ کہ ڈیکلریشن سے محروم شہری کو عدالت سے دادرسی کا حق نہیں تھا۔ چنانچہ بہت سے ڈیکلریشن عدمِ کارروائی کی بنا پر کھٹائی میں پڑے رہے

(بشکریہ لیل و نہار، ۵ اپریل ۱۹۷۰ء)

بقیہ:- ادھر کا کھیت

گردن ہلا کر "بجلوہ ریزی" "کمّل دہ بہ پر فشانی" ریش لپنے سکوت کا ثبوت دیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں، فرمایا "ادھر کا کھیت"۔

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دوں۔ ؟ کمل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا "کاتبین" پر ڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان کے نام ونشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اظہارِ خیال فرمائیں گے، مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر میں بھی کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ خلطِ مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے، میں نے کہا کون نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنایئے گا؟ کہنے لگے جی نہیں وائس چانسلر صاحب نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو شعر سنائیے گا ؎

تراکہ زور بیازوے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ کہ آن حسرتِ کہن باقیست

فرمایا یہ کیا، میں نے کہا یہ ہے ؎

من آں علم و ہنر را با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا، ارے میاں یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو، اچھا تمہارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمہارا لیکچر سنوں گا۔ میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہو گا۔ فرمایا، السلام علیکم۔

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔"

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار۔
(۲) اگر عنوان بُرا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔
(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار۔
(۴) اگر کل بُرا ہے تو ناظرین ذمہ دار۔

خط و کتابت "ترسیل زر" میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

پامال دھرتی سے آسمانوں کا رشتہ

شبنم مناروی

ہملہ رو پڑا اور تند خوسفاک لہروں نے
میرے گاؤں، میرے شہروں، میرے گھر کو ڈبو ڈالا
بھنور کا دیوتا جلاد تھا جس نے
ہزاروں عورتوں، بچوں، جوانمردوں کی لاشوں کو
بپھرتی تند خو لہروں کے نیزوں میں پرو ڈالا
وہ سورج دفعتاً اوج ثریا سے اتر آیا
ہوائیں اس کو اپنے بازوؤں میں تھام کر اتریں جزیروں میں
فلک نے جھک کے دیکھا ! چند چمکیلے ستاروں کو جھٹک کر رو دیا
پھر صبح کی دیوی نے زلفوں کو جھٹک کر اس کی پیشانی کو چوما
اور کہا - "بیٹا خدا حافظ"
پھر اُس کے بعد چاروں سمت سے محروم آنکھوں نے
ہر اک جینے کی خواہش نوچ ڈالی اپنے چہرے سے
وہ گہرے پانیوں میں ڈوب کر پھر سے اُبھرتا
اک نیا آغاز ہوتا ! لیکن کس لئے ؟
اس کے تو ادنیٰ نوکروں کے پاس بھی تخت سلیماں تھے
غنیمت ہے کہ اس نے پھر "مخیر" بادشاہوں کی طرح خیرات بانٹی
لوگ خوش تھے دیوتاؤں کا پجاری
ایک لمحہ کے لئے دھرتی نشیں تھا
وہ من و سلویٰ اترنے کے کٹھن لمحے بھلا کیسے بھلا سکتے ہیں؟
کیسے بھول سکتے ہیں ؟ وہ ہیلی کاپٹر، پانی کے ریلے، کشتیاں،
ہاتھوں کی لرزش، کیمرے کی آنکھ اور ٹی وی پہ رقصاں مورتیں
لہروں کی زد میں چیختے بچے
درختوں پر لٹکتے بے بسوں کی گردنوں میں جھولتے سانپوں کا منظر
پانیوں میں غرق قصبوں کے مکانوں کی چھتوں پر
خوف سے دہشت زدہ بچے
کنواری لڑکیاں ننگے بدن، اترے ہوئے چہرے

○

من و سلویٰ اترنے کے دنوں میں
چند بزدل بھیڑیئے بھی شہر کی ویران سڑکوں پر
گلے میں تختیاں لٹکا کے نکلے
اک نئے انداز سے ہولی رچائی اور کہا
"ہمیں بھی کاپٹر دو، کشتیاں دو، جگ ہنسائی دو
ہمیں خواجہ بنا دو، بندگی سے اب رہائی دو
ہمیں تخت سلیماں دو کہ ہم بھی دیوتاؤں کی طرح کیڑوں مکوڑوں کو دہائی دیں
ہمیں بھی بانٹ دو مالِ غنیمت کی یہ لاشیں
ورنہ ہم کو جیل بھیجو - اب وہاں آرام ہو گا
ہم بہادر ہیں - بھنور میں جا نہیں سکتے
ہمیں تختِ سلیماں دو
ہمیں بھی بانٹ دو مالِ غنیمت کی یہ لاشیں"
بانٹ دو نا ! — بانٹ بھی دو !!

افسانہ

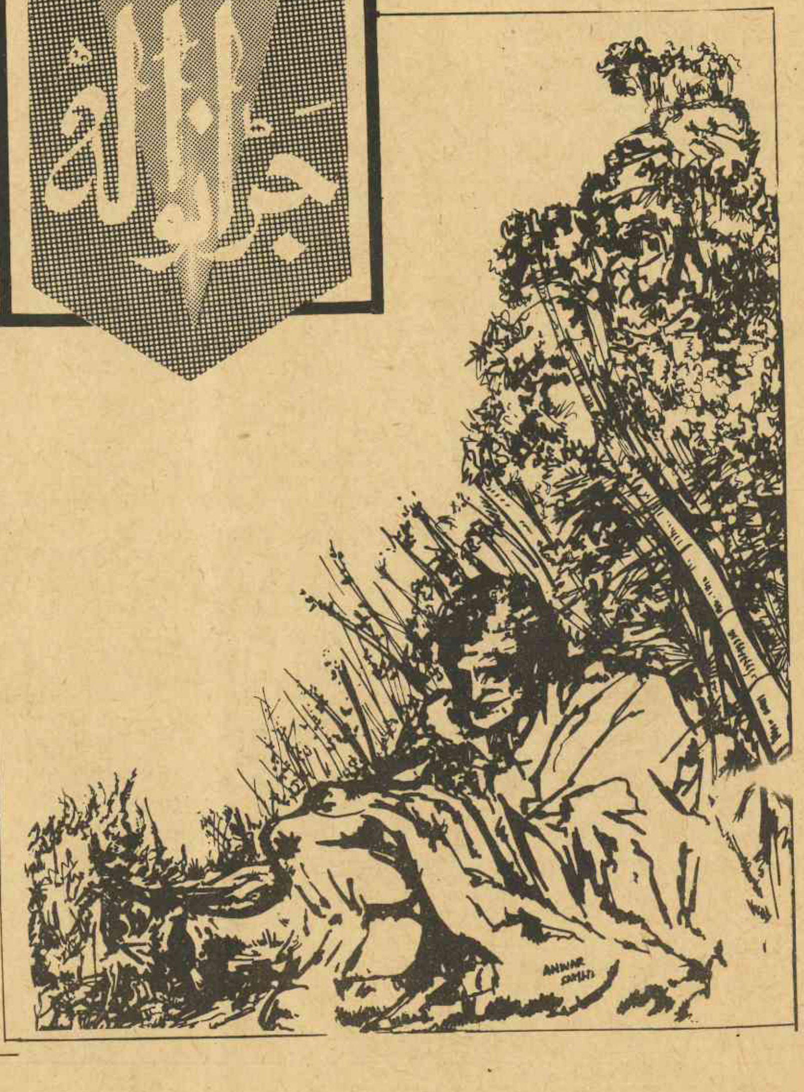
فاروق خالد

براستہ زلزلہ

شبیر حسین نے جب پہلی مرتبہ سیلاب زدگان کے بارے میں رُوح فرسا خبریں پڑھیں تو اُسے قلبی دکھ ہوا۔ یہ دکھ اور درد کا تاثر ایک لہر کی طرح اُمنڈتا ہوا آیا تھا جو اُسے بھگوتا ہوا واپس مڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنے خیالات کو وسعت دی اور انہیں پھیلا کر رکھ دیا تاکہ یہ خشک ہو جائیں اور خوشگوار سماں بیدار ہو۔ اس ضمن میں اُسے کوئی خاص محنت صرف کرنی نہیں پڑی تھی کیونکہ ایک طرح سے یہ اس کی عادت بن چکی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً ان ادھوری مہمات یا سر کردہ فتوحات کی جزئیات میں کھو جاتا تھا جن سے اُسے سابقہ پڑنے والا ہوتا تھا۔ خبریں پڑھ چکنے کے بعد اس نے متاثرہ علاقوں کی تصاویر دیکھنی شروع کیں جو بہت ہی خوفناک تھیں۔ تباہی و بربادی ہر چیز کو روندتی ہوئی گزر گئی تھی۔ پانی کی بے رحم موجوں نے چاروں طرف خاموشی کا وہ سماں باندھ رکھا تھا جو پُرانے قبرستانوں پر طاری ہوتا ہے۔ تصاویر میں کچے مکانات تھے جن کی صرف چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ یا پھر درختوں کے اُوپر والے وہ حصے تھے، جو اپنی بے بس ننگی ٹہنیوں اور برہنہ پتیوں سمیت پانی کی سفید چادر پر یوں تنے کھڑے تھے جیسے امیروں نے شفاف اور وسیع ڈائننگ ٹیبلوں پر ڈیکوریشن پیسز سجا رکھے ہوں۔

آگے پانی تھا اور پیچھے بھی پانی تھا۔ بعض تصاویر میں تنہائی کا راج تھا، اور بعض میں شور چنگھاڑتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ کچھ تصاویر میں تباہ حال بے خانماں لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کی حالت انتہائی دگرگوں تھی۔ عورتیں تھیں جو دیواروں کے سایے تلے چارپائیوں کی اوٹ میں چھپی بیٹھی تھیں۔ وہ لڑکیاں جو اپنے وسیع مکانات کے چوڑے چکلے دالانوں میں بے دھڑک کھیلتی کودتی تھیں، اس وقت کونوں کھدروں میں یوں سر جھکائے سمٹی بیٹھی تھیں جیسے بے رحم فطرت نے یک لخت انہیں اُٹھا کر نیلام گھر پہنچا دیا ہو۔ شبیر یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا کیونکہ کسی شخص کی سوچ کے بارے میں صحیح معلوم کرنا ناممکن بات ہے، اس لئے سرِدست اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دفتر سے آج اُسے چھٹی تھی۔ اس نے اپنی سفید زین کی دودھ جیسی پتلون نکالی اور کلف لگی بوشرٹ پہن کر اُن علاقوں کی طرف روانہ ہو گیا جن سے وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ سڑک کے دو رویہ کچے فٹ پاتھوں پر، دراصل انہیں فٹ پاتھ کہنا غلط ہے، یوں سمجھئے کہ سڑک بنانے کے بعد جو خالی جگہ بچ گئی تھی اس پر ان مفلوک الحال لوگوں نے رہائش گاہیں بنا رکھی تھیں۔ سب لوگ فارغ اور عدیم الفرصت تھے یا پھر دعائیں مانگ رہے تھے،



اور قرآن پڑھ رہے تھے۔ البتہ ان کی عورتیں بچے کھچے سامان کو جن میں کیچڑ اور پانی سے بھیگے ہوئے بستر، چند برتن اور چھوٹے بڑے ڈبوں میں بند متفرق اشیاء شامل تھیں، مناسب و موزوں جگہ پر رکھنے کی فکر میں تھیں۔ لوگ یا تو فارغ بیٹھے تھے یا پھر ان رضاکاروں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے جن سے کچھ ملنے کی اُمید تھی۔ شبیر نے چند لوگوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر اسے سخت نا اُمیدی ہوئی کیونکہ ہر شخص پہلی ہی نظر میں اسے دیکھ کر یہ بخوبی جان لیتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں لیبا کوئی تھیلا یا کوئی اور بڑا کپڑا نہیں ہے جس میں اجناس کے ہونے کی توقع کی جا سکتی ہو۔ وہ نسبتاً سنسان علاقے کی طرف گیا جہاں درختوں کے جھنڈ تھے اور لاتعداد بے ترتیب جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ یہاں اسے سوائے ان جھاڑیوں اور درختوں کے تنوں کے اور کچھ نہ ملا۔ اس لئے وہ واپس آ گیا۔

شام تک وہ یہاں سے وہاں تک کئی چکر لگا چکا تھا۔ چند ایک لوگوں نے اس سے بات بھی کی مگر ان میں وہ کارکن شامل تھے جو مختلف امدادی پارٹیوں کے ہمراہ آئے ہوئے تھے، یا پھر وہ لوگ تھے جو ان کارکنوں کا پتہ پوچھتے پھر رہے تھے۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ ایک دیہاتی اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ شکل ہی سے پست حال اور ماضی کا مارا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شبیر نے ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور سگریٹ پینے میں مشغول ہو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ شخص اس کے پاس کھڑا تھا۔ اور دھیمے لہجے میں سیلاب کی آمد اور تباہ کاریوں کا ذکر کرنے لگا۔ اس مفلوک الحال شخص نے جو ایک پرانی اور موٹی پتلون پہنے ہوئے تھا، کندھے پر ڈالے ہوئے صافے اور سر پر باندھی ہوئی بے ترتیب پگڑی سمیت یہ تاثر دینے میں خلوص دل سے ناکام ہو گیا تھا کہ اس نے تہبند کی جگہ پتلون پہنی ہوئی ہے، اور بھی بہت سے لوگوں نے امدادی ساز و سامان میں آئی ہوئی پتلونیں اور قمیضیں پہن رکھی تھیں مگر اس کی ہیئت کذائی سب سے مختلف تھی۔ شبیر نے اس شخص میں کوئی دلچسپی نہ لی کیونکہ اس قسم کے لوگوں میں دلچسپی لینا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا جلد ہی اس تباہ حال شخص نے دیہات کے اجڑنے کی ملی جلی داستان سنانے کے بعد اپنی تمباکو کی فصل کے نیست و نابود ہونیکا بڑے ہی دردناک پیرائے میں ذکر کیا اور بولا۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم جیسے بے گھر اور بے دھن لوگ اب تمباکو کیسے پی سکیں گے"۔ شبیر نے اپنا ادھ جلا سگریٹ اسے تھمایا اور واپس اس طرف کو چل دیا جہاں بے گھر لوگوں کا قیام تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے ایک بوڑھی عورت جو اپنی بیٹی سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی، کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"ماں جی اگر میرے لئے کوئی خدمت ہو تو بتائیں"۔

اس عورت نے اسے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایک طرف منہ کر کے خاموش ہو گئی۔ شبیر نے ندامت اور پشیمانی کے ہاتھوں عاجز آ کر منہ میں دبائے ہوئے سگریٹ کو دانتوں میں جکڑتے ہوئے ایک زوردار پھونک ماری جس سے سلگتا ہوا گل اچھل کر دور جا گرا۔ اور وہ باقی ماندہ سگریٹ کو چباتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آگے وہی کچھ تھا جو کچھ وہ پہلے دیکھ آیا تھا۔ اور دیکھ دیکھ کر اکتا چکا تھا۔ اس کی سفید پتلون جسے اس نے بڑے چاؤ اور اشتیاق سے پہنا تھا اب گھٹنوں سے سرمئی اور پائنچوں سے قدرے سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ اس پر جگہ جگہ کیچڑ اور گندے مٹیالے پانی کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے سیاہ چمکیلے بوٹ جو کچھ دیر پہلے خوب چمک رہے تھے، اب گرد و غبار میں یوں چھپے ہوئے تھے کہ وہ انگلی کی مدد سے بڑی آسانی سے اپنا نام لکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا نام تو نہ لکھا بلکہ ان راہوں سے اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا واپس ہو گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے کھانا کھایا اور سو گیا۔ مگر جس نا امیدی اور پریشانی سے اسے صبح سابقہ پڑا تھا، اس نے اس پر کچھ اس طرح کے اثرات مرتب کئے تھے کہ اسے لمحہ بھر کے لئے سکون میسر نہ آیا۔ وہ اٹھا اور دن بھر کا تکدر دور کرنے کی خاطر ایک قریبی سینما ہال میں گھس گیا۔ شام کو اس کی مصروفیات رنگ رنگیلی اور انواع اقسام کی ہوتی تھیں۔ لیکن آج اس کا دماغ معاملات اور واقعات کی ضرب و تقسیم میں اس بری طرح سے اُلجھا ہوا تھا کہ اس نے کسی پروگرام میں حصہ نہ لیا اور حوادث کو سینے میں چھپائے صبح کی اُمید لئے سو گیا۔

شبیر حسین نے صبح اٹھ کر کھانے پینے والی اشیاء کی وافر مقدار خریدی جن میں بھنے ہوئے چنے، حلیم اور نان شامل تھے۔ اس نے ان تمام اشیاء کو احتیاط سے یکجا کر کے پلٹیا سا اور سیلاب زدگان کے کیمپوں کی طرف چلا گیا۔ کل خالی ہاتھ اور یوں منہ اٹھائے چلے آنے سے اسے بڑی کوفت ہوئی تھی۔ اور اس نے اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ اس کا ازالہ ضرور کرے گا۔ وہاں پہنچ کر اس نے یہاں سے وہاں تک پھر ایک چکر لگایا اور اطراف میں بکھرے ہوئے افراد کو نگاہوں میں اچھالتا ہوا گزرتا چلا گیا۔ وہ بوڑھی عورت جس نے کل اس سے بات تک کرنی گوارہ نہ کی تھی اپنی لڑکی کے ساتھ بیٹھی لکڑی کے ایک صندوق میں کیلیں ٹھونک رہی تھی اور اس کی لڑکی ایک پرانے زنگ آلود ڈبے میں سے صحیح سالم کیل نکال نکال کر اسے دے رہی تھی۔ ان کے پاس ہی ایک بڑی عمر کا مرد بیٹھا تھا جو کچھ نہیں کر رہا تھا صرف اداس اور پریشان تھا۔ شبیر نے پاس جاتے ہوئے سلام کیا اور ادب سے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے خورد و نوش کی اشیاء میں سے کچھ حصہ باہر نکالا اور اس پریشان حال آدمی کو دیتے ہوئے بولا۔

"یہ لیجئے بڑی مشکل سے بندوبست ہوا ہے حکومت بڑی تیزی سے امدادی سرگرمیوں میں مشغول ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی حالات بہتر ہو جائیں گے"۔

اس کے بعد وہ دیر تک ان کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا جو قطعی فضول ہونے کے باوجود کسی حد تک سیلاب زدگان سے متعلق تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہہ جاتا جو برمحل نہ ہوتی تو فوراً ہی کمال صفائی سے اس کا ربط سیلاب سے جوڑ دیتا تھا۔ اب یہ دیہاتی لوگ بھی اس سے گھل مل گئے تھے اور اپنے سادہ اور صاف لہجے میں اس سے سیدھی سادی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان سے باتیں کرتا رہا، لیکن اس دوران بوڑھی عورت کی بیٹی یا وہ اس کی جو کچھ بھی تھی بالکل

خاموش رہی، جیسے سمجھتی ہو کہ اس کا بولنا ضروری نہیں ہے۔ یہ تیرہ چودہ برس کی ایک بھولی بھالی لڑکی تھی جس نے سرخ رنگ کی گھیرے دار شلوار پہن رکھی تھی۔ اور ایک موٹے سوتی دوپٹے سے سینے کو اچھی طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے گھٹنے ٹھوڑی کو چھو رہے تھے۔ اور وہ اپنے پاؤں کے ناخن سے کچھ کریدنے میں مصروف تھی۔ سرخ رنگ کی شلوار نے جس انداز سے اس کی ٹھوڑی کو چھو رکھا تھا اس سے رخسار اور بالائی لب پر ایک تابناک ہالہ بن گیا تھا۔ شبیر نے چاہا کہ وہ اسے متوجہ کرے اور اس سے باتیں کرے مگر اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت خود بخود اُب گئی اور وہ رنجیدہ ہو کر یہاں سے بہتر نتائج کی توقع میں اٹھ کھڑا ہوا۔

چند قدم آگے اسے ایک اور خاندان نظر آیا جس کے افراد ایک محدود جگہ میں مرغیوں اور مویشیوں کی طرح دبکے ہوئے تھے۔ ایک قدرے موٹی اور اچھے نین نقش کی عورت جس کے بالوں میں دھول اور آنکھوں میں گزرے ہوئے واقعات کی بھول تھی۔ ایک طرف خود ساختہ چولہے پر ہنڈیا میں کچھ پکانے میں مصروف تھی۔ اور دو نوجوان لڑکیاں غیر ضروری طور پر اس کا ہاتھ بٹانے میں مشغول تھیں۔ اس نے باہر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ایک شخص سے جو حقہ پی رہا تھا دعا سلام کی اور کھانے پینے کی اشیاء دیتے ہوئے نرم اور کسی قدر جھجکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جناب آپ انہیں رکھیں، ہمیں احساس ہے کہ امدادی کام کی رفتار انتہائی سُست ہے لیکن ہم کوشش کر رہے ہیں کہ جلد ہی آپ لوگوں کے نقصان اور رنج کی تلافی ہو سکے۔"

اس شخص نے تشکر آمیز لہجے میں اس کی طرف دیکھا اور بڑے احترام سے پاس بٹھالیا۔ وہ ایک ایسی آواز میں گویا ہوا جیسے رنج اور دوسرے عوامل نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ "آپ لوگ ہماری بڑی خدمت کر رہے ہیں خدا آپ کا بھلا کرے۔" اس نے بڑی مشکل سے یہ لفظ ادا کئے اور حقے کی نے پرے ہٹا کر اس لمحے کو کوسنے لگا جس نے آج اس سے قوت گویائی چھین لی تھی۔

شبیر یہاں زیادہ دیر نہ بیٹھا کیونکہ ابھی اسے اور مناسب و موزوں جگہوں پر بھی جانا تھا۔ پھر اس نے کئی چکر لگائے۔ ہر طرف گھوما پھرا۔ لیکن اسے کوئی اور مناسب و مستحق شخص نظر نہ آیا۔ وہ دوبارہ اس بوڑھی عورت کے پاس گیا جو لکڑی کا پرانا صندوق مرمت کر رہی تھی۔ اس نے باقی ماندہ خورد و نوش کی اشیاء بھی انہیں دینی چاہیں۔ لیکن انہوں نے بڑی محبت اور تشکر بھرے لہجے میں انکار کر دیا اور کہا:

"خدا تمہارا بھلا کرے، تم جیسے شریف لوگ ہمیں کھانے پینے کو بہت کچھ دے گئے ہیں۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ ہمیں پہننے کو دو جوڑے زنانہ جوتوں کے دے جائیں، ہوا یوں کہ جلدی میں یہ ہم گھر ہی بھول آئے تھے۔" شبیر نے جوتے وغیرہ لانے کا وعدہ کیا اور لوٹ آیا۔ اب اس کے پاس چند ایک نان اور بھنے ہوئے چنوں کی تھوڑی سی مقدار باقی رہ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ اس خاندان کی تلاش شروع کی جسے وہ پہلے ہی کھانے پینے کی چیزیں دے آیا تھا مگر یہ جگہ اب خالی تھی۔ اور وہ لوگ کہیں جا چکے تھے۔ اسے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے کپڑے میں بندھی ہوئی اشیاء بوجھ محسوس ہوئیں تو اس نے انہیں فوراً ہی ایک طرف کو پھینک دیا اور جوتوں کا خیال لئے واپس آگیا۔

ابھی سہ پہر ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شبیر نے بازار سے سستے داموں زنانہ جوتوں کے دو جوڑے خریدے اور واپس اس طرف کو چل دیا جہاں سیلاب زدگان کے کیمپ تھے۔ یہاں ایک طرف لاریاں کھڑی تھیں، جو متاثرہ افراد کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے لئے آئی تھیں۔ پاس ہی پولیس کے چند سپاہی کھڑے تھے جو غیر متعلق لوگوں کو چلے جانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ ایک حوالدار نے اس نے اس سے بھی چند سوال پوچھے، اس نے اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کی تو اسے جانے دیا گیا۔ شبیر جب بوڑھی عورت کے کیمپ میں پہنچا تو وہاں ان کی بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ جو ایک طرف گم سم چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس نے بوڑھی عورت کے بارے میں پوچھا تو وہ ڈری اور ٹھٹھری ہوئی آواز میں صرف اس قدر کہہ سکی کہ وہ ابھی آتے ہیں۔ شبیر خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا لیکن جب سوچ سوچ کے تھک ہار کر کوئی مناسب سوال نہ ڈھونڈ سکا تو پھر بولا۔ "وہ کہاں گئے ہیں؟"

لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں جو شفاف پانیوں کی طرح ساکن اور وادیوں میں مہکنے والی نرم و نازک کلیوں کی طرح متکلم تھیں۔

"جڑانوالہ میں ہمارے چند ایک عزیز رہتے ہیں، اور ہم وہاں جا رہے ہیں، بے بے اور لالہ پتہ کرنے گئے ہیں کہ لاری کب جائے گی۔"

"آؤ میں تمہیں ان کے پاس لے چلتا ہوں۔" شبیر نے کمال شفقت سے جواب دیا۔

"لیکن ہمیں تو جڑانوالہ جانا ہے۔" لڑکی نے ہمک کر کہا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں وہیں چھوڑ آؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔ مجھے معلوم ہے جڑانوالہ کہاں ہے۔"

شبیر نے اس لڑکی کو ساتھ لیا اور باہر نکل آیا۔ وہ اسے لے کر اِدھر اُدھر بلا مقصد گھومتا رہا اور بالآخر واپس آگیا۔ اور پریشانی کے عالم میں افسردہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے وہ اکیلے چلے گئے ہیں، آؤ ہم بھی چلیں۔ میں تمہیں جڑانوالہ کے بالکل پاس لے جاؤں گا۔" شبیر لڑکی کو ہمراہ لئے اس طرف کو چل دیا جہاں درختوں کا بے پرواہ جھنڈ اور لاتعلق جھاڑیوں کی خاموش زبانیں تھیں۔ راستے میں اس نے لڑکی کے استفسار پر بتایا کہ ہمیں تھوڑی دور اور جانا پڑے گا، جڑانوالہ زیادہ دور نہیں ہے۔ جڑانوالہ جانے کا یہ راستہ بڑا گھنا، جڑدار اور خاردار تھا۔ اور اس لڑکی کو ان راہوں پر چلنے کا تجربہ تھا اور نہ کبھی اس کے ساتھ ایسا اتفاق ہوا تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ وہ رونے لگی اور تھوڑی دیر بعد تکلیف کی شدت سے چلانے لگی اور بالآخر بے ہوش ہو گئی۔ اس کی سرخ شلوار میں چہرے کے نقوش ماند پڑ گئے، اور موت کی آرزو میں کہیں چھپ جانے کو بے تاب تھے۔ شبیر نے اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا اور خود رات کی تاریکیوں میں گم ہوتا ہوا شہر آگیا۔

طارق عزیز کو حج کے لئے ۱۵ ہزار روپے کی پیش کش



نسرین اور نجمہ نے

منٹو کے افسانوں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا



رقاصہ نسرین

معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی نسرین نے ثابت کر دیا کہ عورت حیات و نمو کا سرچشمہ ہے

• حبیب •

طارق عزیز خاصے جذباتی ہو رہے تھے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل تھا۔ طارق عزیز تو خیر سے فنکار ہیں، بات بات پر پگھل جانا تو ان کی عادت بن چکی ہے، لیکن ان کی جگہ کوئی پتھر دل انسان بھی ہوتا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا۔

گذشتہ دنوں طارق عزیز اپنے چند فلمی فنکاروں سمیت کراچی پہنچے تھے۔ انہیں یہاں سے پنجاب اور سندھ کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے فنڈ اکٹھا کرنا تھا۔ ان کی اور ان کے فلمی ساتھیوں کی جن میں لالہ سدھیر، رنگیلا، سلطان راہی، الیاس کاشمیری، مصطفےٰ قریشی اور عنایت حسین بھٹی شامل تھے۔ فنڈ جمع کرنے کی مہم خاصی کامیاب رہی۔ انہوں نے اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے جو اپیل کی تھی اس میں واضح طور پر اعتراف کیا گیا تھا کہ کراچی کے عوام نے سیلاب زدگان کی فوری امداد اور آباد کاری کے سلسلے میں غیر معمولی تعاون اور ہمدردی کا عملی مظاہرہ کیا۔ لوگوں نے دل کھول کر عطیات دیئے۔ اس مہم کے دوران انسانی ہمدردی اور وسعت قلبی کی بعض ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں جن پر انسانیت کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اس بات کا بھی پتہ چلا کہ ابھی ایسے لوگ باقی ہیں جنہوں نے اس گھپ اندھیرے میں انسانیت کی مشعل جلا رکھی ہے۔ یہاں ہم ان سیٹھوں اور ساہو کاروں کی بات نہیں کرتے جو انکم ٹیکس بچانے یا کاروباری مراعات حاصل کرنے کے لئے وزیر اعظم فنڈ میں کچھ رقم دے کر رپورٹروں سے اخبارات میں اپنا نام شائع کراتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کی باتیں کر رہے ہیں جو راندہ درگاہ ہیں، ان کے پاس جو کچھ تھا انسانیت کے نام پر اٹھا کر فنکاروں کی جھولی میں ڈال دیا۔

طارق عزیز سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے اس مہم کے تاثرات پوچھے۔ اس سوال پر وہ خاصے جذباتی ہو گئے۔ انہوں نے مخصوص انداز سے جواب دیا۔ ”میں اور میرے فنکار ساتھی کراچی کے عوام کے ممنون ہیں کہ انہوں نے توقع سے بڑھ کر ہماری پذیرائی کی۔ خصوصاً متوسط اور محنت کش طبقے کے لوگوں کے جذبۂ ایثار سے بے حد متاثر ہوا۔ یہ لوگ پہلے ہی افلاس، بھوک اور بیماری کی چکی میں پس رہے ہیں۔ پھر بھی جب ہم اپنی جھولیاں پھیلائے ان تک پہنچے تو انہوں نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ ان کا ایک پیسہ ہمارے نزدیک ایک لاکھ کے برابر ہے۔ ایسے لوگ جب تک زندہ سلامت ہیں ہمارا ملک ہر آزمائش سے سرخرو نکلے گا۔“

انہوں نے بڑے جذباتی انداز میں بتایا۔ ”عطیات کی وصولی کے دوران ہماری ملک اور ان کا گزر بازار حسن سے ہوا۔ ان کی اپیل پر مختلف کوٹھوں سے چندہ ملا۔ مہذب معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں میں سیلاب کی تباہ کاریوں کا گہرا احساس موجود تھا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ جس سماج نے ان سے نسوانی وقار چھین کر کوٹھے کی زینت بنا دیا تھا۔ اس سماج کی تباہی پر ان بد نصیب عورتوں کے دل غمزدہ تھے۔ اور وہ دل سے اس بات کی خواہش مند تھیں کہ سیلاب کی قاتل لہروں نے جن علاقوں میں ویرانی اور موت کا سناٹا پھیلا دیا ہے وہاں از سر نو زندگی کی چہل پہل لوٹ آئے۔“ طارق عزیز نے ہمیں بتایا کہ ”جب بازار حسن کے ایک کوٹھے پر پہنچے تو رقاصہ نسرین نے ٹکٹوں کی پوری کاپی لے لی اور تمام ٹکٹوں کی رقم ۴ ہزار ۴ سو روپے ان کے حوالے کر دیئے۔ اس نے ٹکٹوں کی کاپی بھی واپس کرنے کی کوشش کی، لیکن میں نے منع کر دیا۔“

اسی طرح ایک دوسری رقاصہ نجمہ نے فنکار سدھیر کو دس ہزار روپے کا عطیہ دے کر ثابت کر دیا کہ معاشرہ عورت کو چاہے جس حال میں پہنچا دے، لیکن عورت اس سے کبھی انتقام نہیں لیتی، وہ حیات و نمو کا سرچشمہ ہے۔ وہ ماں ہے، انسان کو جنم دیتی ہے۔ اور ہمیشہ تخلیق اور تعمیر کے گیت گاتی رہے گی چاہے اس کی آواز آنسوؤں میں کیوں نہ ڈوبی ہو۔“

سعادت حسن منٹو اگر آج زندہ ہوتے تو وہ نسرین اور نجمہ کے روپ میں جانکی اور شاردا کو حقیقی رنگ میں دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔ شاید وہ مہذب سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو للکار کر ایک بار پھر کہتے ”رات کی تاریکی میں اپنی ہوس کی آگ بجھانے والے بہروپیو، نسرین اور نجمہ سے

شرافت اور انسانیت کا درس لو، اپنے گریبانوں میں جھانکو اور اپنے چہرے کی سیاہی کو دیکھو۔ تم نے جن عورتوں کو غلاظت اور گندگی کے ڈھیر میں دفن کر دیا تھا وہ آج بھی وہاں پاکیزہ جذبوں کے پھول کھلا رہی ہیں۔ عورت ہر رنگ، ہر روپ میں عظیم ہے۔ مقدس ہے۔"

اس واقعہ سے طارق عزیز ہی متاثر نہ تھے، ہم بھی جذباتی ہو گئے تھے۔ یہ چند سطور شاید اسی جذبات کے ردِ عمل میں ظاہر ہوئی ہیں۔ مجھے کسی رقاصہ یا طوائف سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میرا علم ان کے بارے میں کورے کاغذ کے برابر ہے۔ البتہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے بعض افسانوں میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ابتداء میں ان کے بارے میں میری بھی رائے کچھ اچھی نہ تھی۔ میں بھی دوسروں کی طرح انہیں گندگی کا ڈھیر سمجھتا تھا۔ اور ان سے دور رہنا شرافت اور نیکی سمجھتا تھا۔ منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس ہوا ہے کہ یہ ترکی اور طوائفیں ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔ انہیں اس درجہ گناہ آلود زندگی بسر کرنے پر ہم نے مجبور کیا۔ میں نے پہلی مرتبہ خود کو مجرم محسوس کیا۔ اگر یہ عورتیں گناہ کی پوٹ ہیں تو پھر اس پوٹ کو خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہم نے یہاں تک پہنچایا ہے۔ مجرم وہ نہیں، مجرم ہم ہیں۔ قابلِ نفرت بازارِ حسن کی عورتیں نہیں، وہ لوگ ہیں جو اس بازار کے دکاندار اور گاہک ہیں، جو اپنے "پاکیزہ" اور "جنتی" ہاتھوں سے اس بازار کو سجاتے اور سنوارتے ہیں۔

منٹو کے افسانے بازارِ حسن کی ان بدنصیب عورتوں کے بارے میں میرے خیالات میں عظیم تغیر اور تبدیلی کا باعث بنے۔ طارق عزیز کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ اردو ادب کے اس ریڈیکل ادیب نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ فنکار اپنے فن کی طرح سچا اور کھرا تھا۔

دیکھئے بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ طارق عزیز سے فنڈ جمع کرنے کی مہم کے دوران انکے تاثرات پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے ایک اور دلچسپ واقعہ سنایا۔ متمول طبقہ کی ایک کالونی میں انہیں بلایا گیا۔ یہ لوگ

باقی صفحہ ۳۱ پر



قلم کے مزدور لکھ رہے ہیں

انور شعور

جو خون سڑکوں پہ بہہ رہا تھا جو ظلم انسان سہہ رہا تھا
قلم کے مزدور لکھ رہے تھے
قلم کے مزدور لکھ رہے تھے کہ محنتوں کے معاوضے میں
عظیم محنت کشوں کے معدوں میں صرف فاقے بھرے ہوئے ہیں
اور ان کے اجسامِ آہنی پر فقط لباسِ برہنگی ہے
اور ان کے بچوں کی تربیت کے لئے مدارس کھلے ہوئے ہیں
اور ان کے رہنے کو تنگ، ترچھے، طویل فٹ پاتھ
ہر سڑک پر بچھے ہوئے ہیں
اور ان کے امراض دور کرنے کو گورکن مستعد کھڑے ہیں
قلم کے مزدور لکھ رہے تھے

قلم کے مزدور لکھ رہے ہیں
اور ان کی تحریر کا ہر حرف منقسم وقت پڑھ رہا ہے

خیبر سے
کیماڑی تک

حیدرآباد

انڈس گیس کمپنی کی انتظامیہ معاہدے سے منحرف ہو گئی

• محمد نقی •

انڈس گیس ایمپلائز یونین نے تقریباً چار ماہ کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں ۲۸ مئی ۱۹۷۳ء کو انتظامیہ سے ۲½ سال کا معاہدہ کیا۔ اسکے بعد یونین نے کوئی نیا مطالبہ پیش نہیں کیا۔

معاہدہ کے بعد انتظامیہ کے تمام افسران نے ایک اجلاس طلب کیا جس میں فیصلہ کیا کہ تمام افسران اپنا رویہ بالکل سخت کرلیں، اور ایسا ماحول پیدا کریں جس سے مزدور ذہنی وجسمانی طور پر مفلوج ہو کر غلاموں کی سی حیثیت کرلیں تاکہ افسر شاہی کی دھاندلیوں اور روزمرہ کی تکالیف پر مزدور متحدہ جدوجہد نہ کرسکیں۔ اس منصوبہ سے پہلے انڈس گیس کمپنی میں کبھی ٹائم آفس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ تمام مزدور اپنے اپنے سیکشنوں میں رکھے ہوئے رجسٹروں پر حاضریاں لگایا کرتے تھے۔ لیکن انتظامیہ نے یونین کے مشورے کے بغیر اچانک ٹائم آفس کھول دیا ہے۔ دو دن تک مزدوروں نے گیٹ پر ٹائم آفس پر رکھے ہوئے حاضری کے رجسٹروں میں لائن لگا کر حاضری لگائی۔ لیکن انڈس گیس کے تمام پڑھے لکھے مزدوروں کے ذہن اس اقدام کو قبول نہ کرسکے کہ سترہ اٹھارہ سال تک اپنے اپنے سیکشنوں میں حاضری لگائی اور اب حاضری لگانے کے لئے گیٹ پر اپنی باری کا انتظار کریں۔۔۔ مزدوروں نے مشترکہ جدوجہد کرکے انتظامیہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنا اقدام واپس لے۔ ٹائم آفس ختم ہونے کے بعد یونین کے عہدیداروں نے انتظامیہ سے رجوع کیا کہ معاہدہ سے پہلے مزدوروں میں بے چینی تھی۔ ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے اور اب کوئی مطالبہ باقی نہیں ہے۔ لہٰذا انتظامیہ کو بلا وجہ حالات خراب نہیں کرنا چاہیئے، جن سے بے چینی پیدا ہو۔ جس پر زبانی طور سے انتظامیہ نے ہمارے ساتھ پورا اتفاق کیا اور طے پایا کہ آئندہ کام کی ترقی کے متعلق تمام اقدامات جو مزدوروں سے تعلق رکھتے ہوں گے وہ یونین سے مشورہ کرکے عمل میں لائے جائیں گے۔ لیکن انتظامیہ نے افسران کے اجلاس میں مشترکہ طور پر بنائے ہوئے، مزدوروں کے خلاف منصوبہ کو دوبارہ عملی شکل اس طرح دی کہ عرصہ دراز سے سروس رولز، معاہدوں اور رسم ورواج کے تحت ملتی ہوئی مراعات اور سہولیات میں سے چند ایک کو ختم اور چند میں تبدیلیاں کردیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) معاہدہ سے پہلے تمام مزدوروں سے صرف ٹیکنیکل مزدور کو ڈبل ریٹ گھنٹوں کے حساب سے اوور ٹائم کی ادائیگی کی جاتی تھی۔ بقایا میں کلریکل مزدور اور چوکیداروں کو اوور ٹائم کم ملتا تھا۔ قانون میں اوور ٹائم کی ادائیگی تمام مزدوروں کو ڈبل ریٹ سے ادا کرنے کا حکم موجود ہے۔ لہٰذا یونین اور انتظامیہ کے درمیان معاہدہ ہوا کہ "اوور ٹائم قانون کے مطابق ادا کیا جائے گا"۔ لیکن انتظامیہ نے ایک سرکلر نکالا جس میں تحریر ہے کہ قانون کے مطابق ایک ہفتہ میں ۴۸ گھنٹے کام کرنے کے بعد سے اوور ٹائم کا وقت شمار کیا جائے گا اور وہ ڈبل ریٹ گھنٹوں کے حساب سے ادا کیا جائے گا۔ چوکیدار، کوٹیٹر اور خاکروب قانون کے تحت نہیں آتے لہٰذا انہیں ڈبل ریٹ کے حساب سے اوور ٹائم ادا نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکنیکل مزدور ہفتہ میں ڈھائی گھنٹے اور کلریکل مزدور ہفتے میں ساڑھے دس گھنٹے مفت کام کریں۔ اس کے بعد سے اوور ٹائم کا وقت شمار کیا جائے گا۔ بلکہ اس معاملہ میں یہ کہتے ہیں کہ پہلے آجر مزدوروں سے ہفتہ میں سو گھنٹوں سے بھی زائد کام لیا کرتے تھے۔ لہٰذا حکومت نے قانون نافذ کیا کہ کوئی بھی آجر ۴۸ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں لے سکتا۔ اور اگر کام زیادہ لے گا تو اس کے لئے دوسرا قانون نافذ کیا ہے کہ ڈبل ریٹ گھنٹوں کے حساب اوور ٹائم ادا کیا جائے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قانون میں زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹے کم سے کم یہ کہ کسی کمپنی، فیکٹری یا ملز وغیرہ میں سروس رولز، معاہدہ یا رسم ورواج کے مطابق جو بھی کام کرنے کا وقت مقرر ہو، اس کے فوراً بعد سے مزید کام کرنے پر ڈبل ریٹ گھنٹوں کے حساب سے اوور ٹائم ادا ہونا چاہیئے۔ انڈس گیس کمپنی میں شروع ہی ٹیکنیکل مزدوروں کے کام کرنے کے ایک ہفتہ میں ۴۵½ گھنٹے اور کلریکل کے ۳۷½ گھنٹے ہیں۔ اب انتظامیہ کہتی ہے کہ ۲½ اور ۱۰½ گھنٹے مفت کام کرو اس کے بعد اوور ٹائم ادا کیا جائے گا۔

(۲) ۱۹۶۶ء، ۱۹۶۹ء اور ۷۰ء کے معاہدہ کے تحت چھٹیوں کے دنوں میں کام کرنے والوں کو ڈبل اوور ٹائم اور (COMPANTORY LEAVE) دی جاتی تھی انتظامیہ نے اب آفس آرڈر کے ذریعے چند مزدوروں کی چھٹیوں کے

مزدوروں کو اشتعال دلانے کے لئے نت نئے احکامات کی بھرمار

دنوں میں ڈیوٹیاں لگانا اور اس کے بارے کسی اور دن چھٹی دینا شروع کی ہیں۔ اوور ٹائم قطعی بند کر دیا ہے۔

(۳) انڈس گیس کمپنی میں کبھی شفٹ ڈیوٹیاں نہیں ہوتی تھیں۔ اور نہ ہی اب شفٹ ڈیوٹیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن انتظامیہ نے صرف اوور ٹائم بچانے اور مزدوروں کو ذہنی طور پر پریشان کرنے کے لئے آفس آرڈر کے ذریعہ شفٹ ڈیوٹیاں لگانا شروع کی ہیں۔

(۴) معاہدہ کے تحت مزدوروں کو ترقیاں ملازمت کی مدت کی بنیاد پر ہوا کرتی تھیں۔ اب انتظامیہ نے ایک سرکلر جاری کیا ہے کہ آئندہ ترقیاں ٹیسٹ کے ذریعے ہونگی۔

(۵) ایک چوکیدار اور ایک چپراسی جو کہ تقریباً سولہ سترہ سال کی ملازمت کے بعد ترقی پا کر ہیڈ چوکیدار اور جمعہ دار بنے ہیں۔ لیکن انتظامیہ ان سے مستقل پرانی ڈیوٹیاں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔

(۶) ایک ڈرائیور جس کو انتظامیہ نے کافی عرصہ پہلے جونیئر فٹر بنایا تھا۔ لیکن اس کو اب تک تنخواہ اور گریڈ ڈرائیور کا مل رہا ہے۔ جبکہ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ڈبلیو۔ پی آئی۔ ڈی۔ سی کے بڑے افسران کے دستخطوں سے اس کا گریڈ منظور ہو کر آچکا تھا، لیکن انتظامیہ نے انتقاماً اسکے منظور شدہ کاغذات دبا لیے۔ اس مرتبہ ۲۸ مئی ۷۳ء کے معاہدہ میں بھی یونین اور انتظامیہ کے درمیان معاہدہ ہوا کہ اس کو اس کی جونیئر فٹر کے عہدہ پر فائز ہونے کے وقت سے اس کا گریڈ اور تنخواہ دی جائے گی۔ معاہدہ کے بعد اس معاملہ کے تمام کاغذات اور ایڈوائز ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے افسران کی منظوری کے لئے آئے اور منظور ہو گئے۔ لیکن انتظامیہ نے دوبارہ دھاندلی کی اور پھر ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی سی کو کاغذات بھیجے۔ اس مرتبہ بھی تمام متعلقہ افسران نے دوبارہ منظور کر لیا۔ لیکن انتظامیہ نے ابھی تک ایڈوائز جاری نہیں کی۔

(۷) یونین نے انتظامیہ سے کئی بار بات چیت کی مگر انتظامیہ کا رویہ غلطیوں کو درست کرنے کے معاملہ میں قطعی طور پر ہٹ دھرمی والا رہا۔ جب انتظامیہ اور یونین کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی تو ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی سے جنرل مینجر لیبر کو بلایا گیا، اس کے ساتھ یونین کی میٹنگ ہوئی، اور تقریباً تمام معاملے طے ہو گئے۔ لیکن مینجر کے جانے کے بعد انڈس گیس کی انتظامیہ طے شدہ معاملات سے اس لئے پھر گئی تاکہ مزدوروں کو اشتعال دلا کر کوئی ہنگامہ کرا دیا جائے۔ لیکن مزدوروں نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی تکالیف کو دور کرانے کے لئے جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجہ میں فوری طور پر مقامی انتظامیہ اور لیبر ڈیپارٹمنٹ کے دو اسسٹنٹ لیبر ڈائریکٹروں نے مداخلت کی اور بات چیت شروع ہوئی۔

انتظامیہ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے میٹنگ برخاست ہو گئی اور دوسری میٹنگ ۷ اگست کو ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے لیبر افسر کی موجودگی میں ہونا طے پایا۔ ۲ اگست کو ڈبلیو۔ پی آئی۔ ڈی۔ سی سے ڈپٹی مینجر لیبر مسٹر محمود حیدرآباد تشریف لائے تاکہ ۷ اگست والی میٹنگ میں شریک ہو سکیں۔ لیکن انتظامیہ نے ایک دن پہلے ہی یونین کو پیغام بھیجا کہ وہ بات چیت کرے۔ اور ۷ تاریخ والی لیبر ڈیپارٹمنٹ کی میٹنگ کو بھی منسوخ کر لیں ہم معاملات طے کر لیں گے۔ یونین نے فوراً انتظامیہ سے بات چیت شروع کر دی۔ جس پر انتظامیہ نے اوپر بیان کردہ تمام غلطیوں کو درست کرنے کا وعدہ کیا۔ ۷ اگست کو انتظامیہ نے لیبر ڈیپارٹمنٹ میں اطلاع دی کہ ہمارا اور یونین کا تصفیہ ہو گیا ہے۔ لہذا میٹنگ منسوخ کر دی جائے۔ انتظامیہ کی جانب سے عمل در آمد کی مقرر کردہ تاریخ ۸ اگست جب گزری تو یونین کو انتظامیہ کا یہ جواب سن کر بہت حیرانی ہوئی کہ ہم سے کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں خاص بات یہ ہے کہ ۶ اگست کو انتظامیہ سے بات چیت کے دوران علیحدگی میں انڈس گیس کمپنی کے ڈپٹی چیف انجینئر مسٹر نسیم الریاض اور ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے ڈپٹی مینجر لیبر مسٹر محمود نے یونین کو بتایا کہ تمہاری تکالیف جائز ہیں۔ ہم پہلے جنرل مینجر سے بات کر چکے ہیں۔ وہ بضد تھے اب تمام تکالیف دور کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

مینٹل ہسپتال حیدرآباد

میں بدعنوانیاں!

مینٹل ہسپتال حیدرآباد بدعنوانیوں کا گڑھ بن چکا ہے۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور اپنے الفاظ کو قانون کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ ہسپتال کا پورا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ موصوف پر مبینہ طور پر یہ الزامات لگائے جاتے ہیں۔

و۔ ہسپتال کے تعمیراتی کاموں میں ہسپتال کے ملازمین سے مزدوروں اور مالیوں کا کام لیا گیا۔

و۔ سرکاری درختوں کو بغیر کسی اجازت یا ضرورت کے کٹوا کر فرنیچر اور کوئلہ بنوا کر ذاتی استعمال میں لایا گیا۔

و۔ ہسپتال کا پرانا ریکارڈ جلا دیا گیا۔

و۔ سرکاری رقم خرد برد کی گئی اور اعلیٰ احکام سے گٹھ جوڑ کر کے معاملے کو دبا دیا گیا۔

و۔ داخلہ کا طریقہ کار اتنا پیچیدہ بنا دیا گیا کہ اب داخلہ کے لئے اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے جس کا کوئی حساب نہیں رکھا جاتا۔

و۔ ذاتی عناد کی بنا پر متعدد ملازمین کو برطرف کر دیا گیا۔

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے اپنی انتظامی خامیوں بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے اور اعلیٰ احکام پر اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لئے دفتر کے قریب کے چند وارڈ سجا رکھے ہیں۔ پھول، گھاس اور پھلواری لگا رکھی ہے، جو اعلیٰ احکام کی آمد پر مزید سجا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح "اچھی کارکردگی" کی رپورٹ لے لی جاتی ہے۔ اعلیٰ احکام کو وہ وارڈ نہیں دکھائے جاتے جن میں دماغی مریض بغیر کسی معقول علاج کے جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔

بعض مریض مستقل پاگل نہیں ہوتے ہیں بلکہ کسی

باقی صفحہ ۳۱ پر

پُرامن سوشلسٹ انقلاب کا تجربہ ناکام ہو گیا!

صفحہ ۸ سے آگے

اکتوبر ۱۹۷۰ء کے آخری ہفتے میں چلی حکومت کو سی آئی اے اور آئی ٹی ٹی کی خفیہ سرگرمیوں کا علم ہو گیا۔ چنانچہ مارکسی حکومت نے انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کو فوری طور پر قومی تحویل میں لے لیا۔ اس کے سرمایہ کو ضبط کر لیا۔ کارپوریشن کے سارے ریکارڈ کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد اس کے تین اعلیٰ عہدیداروں کو گرفتار کر لیا۔ اس بات کا انکشاف کارپوریشن کے نائب صدر مسٹر مریم نے مسٹر پیٹرسن کے نام اپنے ایک خط میں کرتے ہوئے کہا کہ

"کارپوریشن کے خلاف اس کارروائی میں ممتاز کمیونسٹوں نے سرگرمی سے حصّہ لیا۔ چلی حکومت کے اس اقدام سے بیرونِ ملک سرمایہ کاری کرنے والے امریکی سرمایہ داروں کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ کارپوریشن کا اثاثہ ہی ضبط نہیں کیا گیا، بلکہ امریکی فرموں میں کام کرنے والے امریکی باشندوں کو نظر بند کر دیا گیا۔"

مسٹر مریم نے امریکی حکومت کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ۔

"چلی کی مارکسی حکومت کا یہ اقدام امریکی سرمایہ داروں کے مفادات کے سخت خلاف ہے۔ اگر سختی سے نوٹس نہ لیا گیا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ بیرونی ملکوں میں ہماری سرمایہ کاری کو زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑے لہٰذا امریکہ کی جانب سے چلی کے امدادی فنڈ کو فوراً منجمد کر دیا جائے۔ جو تقریباً ایک کروڑ ڈالر ماہانہ ہے اس کے علاوہ چلی کو انٹر امریکن ڈیولپمنٹ بنک کی جانب سے جو امداد دی جاتی ہے۔ اس میں امریکہ اپنا حصّہ ادا کرنا بند کر دے۔ مسٹر مریم نے اپنے خط میں مزید لکھا کہ ہمیں یقین ہے کہ امریکی حکومت چلی کی مارکسی حکومت کو سبق سکھانے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھائے گی اور سی آئی اے کے ذریعہ ایسے خفیہ منصوبوں پر عمل درآمد کیا جائے گا جس سے چلی کے طول و عرض میں فتنہ و فساد کے دروازے کھل جائیں۔ اور تباہی مارکسی حکومت کا مقدر بن جائے۔

اس خفیہ رپورٹ میں آگے چل کر لکھا گیا تھا کہ آئندہ ساٹھ دنوں کے دوران سوشلسٹ حکومت کو مالی بحران کا سامنا رہے گا۔ اس پر ضرب لگانے کے لئے یہ موزوں وقت ہو گا۔ اگر حکومت اس مالی بحران سے نکل گئی تو اُسے اپنی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل جائے گا۔ جس سے لاطینی امریکہ کے ساتھ امریکی حکومت کے تعلقات پر تباہ کُن اثر پڑنے کا خطرہ ہے۔

چلی کی سوشلسٹ حکومت کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ بیرونی کمپنیوں کے سرمایہ دار مقامی سرمایہ داروں سے ساز باز کر کے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے فوری ردِعمل کا اظہار کیا اور انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن اور دوسر معدنی وسائل کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ سوشلسٹ حکومت کے اس اقدام سے سرمایہ دار چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے مل کر حکومت کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ کسی خفیہ اور سنسان علاقے میں سرمایہ داروں کا اجتماع ہوتا، جہاں سی آئی اے کے ایجنٹ عوام کو اکسانے کیلئے نئے نئے گر بتاتے۔ رپورٹیں تیار کی جاتیں اور انہیں پڑھ کر سنایا جاتا۔ پھر اس پر بحث و مباحثہ ہوتا اور اس کے بعد چلی کی بعض عوام دشمن سیاسی پارٹیوں کے ذریعہ عوام کو ہنگامہ توڑ پھوڑ اور تشدّد پر اکسایا جاتا۔

سرمایہ داروں نے اپنی سازش کو یہیں ختم نہیں کیا بلکہ چلی کی مسلح افواج میں بے چینی اور بے اطمینانی پھیلانے کے لئے کئی، خطرناک کارروائیاں بھی کیں۔ آئی ٹی ٹی کے نائب صدر مسٹر مریم نے ایک دوسرے مراسلے میں واشنگٹن کو بتایا کہ

"ہم اپنے منصوبے کے مطابق چل رہے ہیں۔ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، پھر بھی جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مسلح افواج کے بعض افسروں نے یقین دلایا ہے کہ "اقتصادی بے چینی میں اضافہ سے ہماری مداخلت کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ ہم بہت غور سے حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جوں ہی ایسا مرحلہ آیا، ہم آگے بڑھیں گے اور سوشلسٹ حکومت کا خاتمہ کر دیں گے۔"

مسٹر مریم نے اپنے مراسلے میں انکشاف کیا کہ بحریہ میں بھی بے چینی کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ یہاں کے بعض بڑے بڑے اخبارات ہمارے نمک خوار ہیں۔ اس میڈیا کے ذریعہ ہم عوام کے ذہنوں میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سول سروس کے اعلیٰ افسران ہمارے ہمنوا ہیں۔ وہ دن رات ہمارے لئے کام کر رہے ہیں۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ہم تمام ذرائع کو استعمال میں لا رہے ہیں۔ اس بات کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ سوشلسٹ حکومت اپنے پروگرام پر کامیابی سے عمل درآمد نہ کر سکے۔"

چلی کی حکومت کے خلاف انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کارپوریشن کی سازش طشت از بام ہو گئی، تو ایلنڈے حکومت نے اسے قومی ملکیت میں لے لیا۔ اس کے علاوہ تانبے کی کانوں کو قومیا لیا گیا۔ یہ کانیں امریکی اجارہ دار سرمایہ داروں کے قبضہ میں تھیں۔ بڑی صنعتوں کو مزدوروں کے کنٹرول میں دیدیا گیا، اور سامراجی اثرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے متعدد اصلاحات کی گئیں۔ امریکی سامراج کے مفادات پر ضرب پڑی تو اس نے چلی کی معیشت کو مفلوج کرنے کی کوشش کی۔ چلی دنیا میں تانبے کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ اسی پر اس کی معیشت کا دارومدار ہے چنانچہ امریکہ نے اپنے ذخائر سے کئی ارب ڈالر کا تانبہ بین الاقوامی منڈی میں جھونک دیا۔ جس کے نتیجہ میں چلی سخت اقتصادی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ امریکہ نے بغاوت پھیلانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن عوام کی بروقت حمایت نے صدر ایلنڈے کی حکومت کو گرنے سے بچا لیا۔

اس ناکامی کے بعد امریکی سامراج سازشیں کرتا رہا۔ چنانچہ گزشتہ کئی ہفتوں سے چلی کے ٹرانسپورٹروں نے ہڑتال کر رکھی تھی، جس کی وجہ سے ملک کا مواصلاتی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ عوام کو اشیائے صرف حاصل کرنے کے لئے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دوسرے چلی کے دکانداروں کی تنظیم نے بھی ملک گیر ہڑتال کی دھمکی دے دی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ چلی کی مسلح افواج میں سامراجی اثرات بڑھ گئے۔ اور اس نے اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو کر سامراجیوں کے ہاتھوں ملک کی آزادی کا سودا کر لیا۔

ڈاکٹر ایلنڈے کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے برسراقتدار آنے کے بعد بورژوا ریاستی ڈھانچے کو نہیں توڑا۔ حالانکہ بورژوا ریاستی ڈھانچے کو توڑے بغیر سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل ناممکن ہے۔ فرانس کے انقلابیوں نے بھی یہی غلطی کی تھی کہ ریاستی ڈھانچے کو جوں کا توں برقرار رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب ناکام ہوگیا۔ ڈاکٹر ایلنڈے کی دوسری غلطی یہ تھی کہ وہ پُرامن اور انتخابات کے ذریعے سوشلسٹ انقلاب لانا چاہتا تھا۔ حالانکہ انقلاب پُرامن ذرائع اور انتخابات کے ذریعے نہیں لایا جاسکتا۔ انقلاب دشمن طاقتیں اور طبقات، اس کی راہ میں سنگین رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان کو توڑنے کے لئے تشدد آمیز عمل لازمی ہوتا ہے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے۔

"انقلاب کوئی دعوتِ طعام یا مضمون نویسی یا مصوری یا کشیدہ کاری نہیں، بلکہ یہ اتنا نفیس، اتنا پُرسکون، کریم النفس، اتنا معتدل، رحم دل، مؤدب محتاط اور عالی ظرف نہیں ہوسکتا۔ انقلاب ایک بغاوت ہے، ایک تشدد آمیز کارروائی ہے جس کے ذریعے ایک طبقہ دوسرے طبقے کا تختہ الٹتا ہے"

ڈاکٹر ایلنڈے کے دورِ حکومت میں عوام میں انقلابی جذبہ پیدا ہوا۔ مسلح جدوجہد پر یقین رکھنے والے کمیونسٹوں کے گروہ میر (MIR) کو کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنی سیاست مزدوروں، اور محنت کش عوام تک پہنچائی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج چلی کے عوام سامراجی فوجی حکومت سے دست بدست جنگ کر رہے ہیں۔

ایلنڈے کی حکومت کا خاتمہ کرکے، امریکہ کے اجارہ دار سرمایہ داروں، چلی کے گماشتہ سرمایہ داروں، بڑے بڑے زمینداروں اور گماشتہ فوج نے چلی میں مسلح سوشلسٹ کی انقلاب کی ابتداء کردی ہے۔ چلی میں مارکسی لیننی پارٹی موجود ہے۔ ایلنڈے کے تین سالہ دورِ حکومت میں چلی کے محنت کش عوام، طلبہ اور عوام دوست دانشوروں نے جو حقوق جیتے تھے وہ ان کے دفاع کے لئے لڑیں گے۔ اب وہ انتخابات کے راستے کو مکمل طور پر ترک کرکے مسلح جدوجہد کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ کیونکہ پُرامن ذرائع سے انقلاب لانے کا تجربہ ناکام ہوگیا۔ چلی کے رجعت پسند اور سامراج نواز عناصر تاریخ کا پہیہ پیچھے نہیں گھما سکتے۔ تاریخ بتائے گی کہ ڈاکٹر ایلنڈے نے اپنی جان دے کر سوشلسٹ انقلاب کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ ■

بقیہ :- سجاد ظہیر

آدمی تھے۔ مخالف نظریات رکھنے والوں سے پیار اور محبت سے ملتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی پیاری شخصیت کا ان کے دل پر گہرا نقش چھوڑتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے اواخر میں وہ پاکستان منتقل ہوگئے لیکن انہیں ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کرلیا گیا۔ حیدرآباد اور مچھ جیل میں ایامِ اسیری کے دوران انہوں نے دو یادگار کتابیں لکھیں جن میں ایک "حافظ شناسی" اور دوسری "روشنائی" ہے۔ روشنائی دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں۔ جو دہلی سے ان کے مجموعہ کلام "نیلم" کی شکل میں شائع ہوئیں۔ سجاد ظہیر کو ۱۹۵۵ء میں جیل سے رہا کیا گیا۔ لیکن فوراً بعد ملک بدر کردیا گیا۔ چنانچہ وہ ہندوستان چلے گئے۔ وہ پاکستان سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس بات کے خواہشمند تھے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ حال ہی میں وہ جرنلسٹ کی حیثیت سے پاکستان آنے کے لئے اجازت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ دہلی میں روزنامہ "حیات" کے مدیر تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لندن میں پاکستان کے سفیر میاں ممتاز دولتانہ سے ملاقات کی تھی جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ میاں صاحب نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک خط کے ذریعہ ان کی اس خواہش کی اطلاع دی تھی لیکن اس سے قبل کہ ان کی یہ تمنا پوری ہوتی وہ انتقال کر گئے۔

سجاد ظہیر زود نویس نہ تھے۔ ۴۵ سالہ ادبی کیریئر کے دوران انہوں نے ایک ناول، چند مختصر افسانے، چند کھیل، جدلیاتی مادیت پر ایک بک لٹ فارسی شاعر حافظ کی تعریف اور روشنائی جیسی یادگار چیزیں تخلیق کیں۔ انہوں نے اپنے قلم سے جو کچھ دیا وہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مختصر افسانوں سے کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس صنف کو چھوڑ کر تنقید نگاری کی جانب مائل ہوگئے۔ درحقیقت ان کے خیالات اور نظریات کے اظہار کا یہ سب سے موثر وسیلہ تھا۔ ان کے مقالے تنقید نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ دلائل دیتے وقت کبھی دوسروں کے جذبات کو مجروح نہ کرتے۔ وہ تنقید کرتے وقت اوچھے ہتھکنڈوں اور ذاتی حملوں سے بہت دور ہوتے تھے۔

قدرت نے انہیں بہت نرم مزاج بنایا تھا۔ وہ اپنی میٹھی زبان سے سب کا دل موہ لیتے۔ خصوصاً نوجوان رائٹروں اور دانشوروں سے ملنے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ادبی ٹھیکیداروں کا لہجہ اختیار نہ کرتے، بلکہ برابری کا درجہ دے کر دوست کی زبان میں گفتگو کرتے۔ ان کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے، اور دوستانہ مشورے دیتے۔ وہ بزرگ اور نوجوان نسل کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے حلقہ میں یکساں مقبول تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص انہیں پیار سے "بنّے بھائی" کے نام سے پکارتا تھا۔

انہوں نے اردو ادیبوں ہی کو منظم نہ کیا بلکہ دوسری زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کو بھی متحد کیا۔ ادبی تحریکوں کو جنم دینے کے لئے پشاور سے ڈھاکہ اور دہلی سے مدراس تک کا سفر ان کے لئے معمول بن گیا تھا۔ اتنے سارے کاموں کے باوجود وہ پُرسکون اور مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ وہ کبھی جلد بازی، تذبذب یا انتشار کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ ہر کام سوچ سمجھ کر انجام دینے کے عادی تھے۔

سجاد ظہیر نے اپنے نظریات کی بقاء کے لئے بھرپور جدوجہد کی، اور قربانیاں بھی دیں۔ انہوں نے دنیا کے تمام انسانوں سے محبت کی اور اس میں کبھی تلخی [illegible] کڑواہٹ پیدا نہ ہونے دی۔ ان کا نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آنے والے ادیب، دانشور اور شاعر ا[illegible] کی ادبی کاوشوں سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔ ■

بقیہ • احوال واقعی

کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی ہے چنانچہ اب چھوٹے سرمایہ دار بھی سرمایہ کاری کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت مزدوروں کے خلاف جو ظالمانہ کارروائیاں کر رہی ہے اس سے ملک کی صنعتی پیداوار افسوسناک حد تک گر گئی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت کس طبقے کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتی ہے۔ قرائن یہ بتلاتے ہیں کہ وہ بڑے زمینداروں اور وڈیروں کے حقوق کا تحفظ کر رہی ہے کیونکہ ان پر زرعی ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ حالانکہ اب تو حکومت نے سینما، ریلوے، اشیائے صرف اور دیگر چیزوں پر سیلاب سرچارج لگا دیا ہے۔ لیکن زرعی شعبہ پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا۔

دنیا میں روایت ہے کہ جب حکومت کسی صنعت کو سرکاری تحویل میں لیتی ہے یا سپلائی پر کنٹرول کرتی ہے تو اس صنعت کی مصنوعات کی قیمتیں کم مقرر کی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں الٹا حساب ہے۔ چینی کھلی مارکیٹ میں ۲ روپے سیر مل جاتی تھی۔ جب حکومت نے اس کی سپلائی اپنے کنٹرول میں لی تو اس کی قیمت میں ۵۰ پیسے فی سیر کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور اب مزید ۵۰ پیسے سرچارج لگا دیا گیا ہے۔ اسی طرح بناسپتی گھی چار روپے ۵۰ پیسے سیر تھا۔ اب اس کی قیمت چھ روپے فی سیر مقرر کی گئی ہے۔ اور اس قیمت پر بھی گھی دستیاب نہیں ہوتا۔

حکومت کا اعتراف ہے کہ مہنگائی کا ایک سبب اسمگلنگ، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس لعنت کا خاتمہ کون کرے گا کیا اس کے لئے آسمان سے فرشتے اتریں گے؟ پولیس، بارڈر پولیس، کسٹم پولیس وغیرہ کس مرض کی دوا ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ بعض معروف اسمگلر جن پر ماضی میں اسمگلنگ کے جرم میں مقدمات چل چکے ہیں۔ اسمبلی کے رکن ہیں اور انہیں بعض وزیروں کی حمایت حاصل ہے۔

ہوش رُبا گرانی دراصل جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں لوٹ کھسوٹ کی مکمل آزادی ہو۔ جہاں اسمگلنگ، چور بازاری، منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی جائز سمجھی جاتی ہو۔ وہاں مہنگائی میں اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب تک یہ نظام ہمارے ملک میں قائم ہے مہنگائی اور گرانی کا بھوت ہمارے سروں پر سوار رہے گا۔

بقیہ • خیبر سے کیماڑی تک

وقت ان پر پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔ جب اس دورے کی کیفیت ختم ہو جاتی تو ہسپتال کی بدنظمی، گندے ماحول میں ان کا دل گھبراتا ہے اور وہ ہسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ہسپتال سے کئی مریض فرار ہو چکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پانچ ملازمین کو غیر معینہ مدت کے لئے معطل کر دیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ ان کی غفلت کی بناء پر مریض فرار ہو گئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مریض ملازمین کی غفلت یا لاپرواہی کے سبب فرار نہیں ہوئے بلکہ اس کا سبب ہسپتال کی انتظامی خامیاں اور خراب ماحول ہے۔ مینٹل ہسپتال حیدرآباد میں روشنی کا انتظام ناقص ہے۔ وارڈوں کی اندرونی دیواریں بہت نیچی ہیں۔ قانون کے مطابق ایک ملازم کی تحویل میں چھ مریض ہونے چاہئیں۔ لیکن اس ہسپتال میں ایک ملازم کے ذمہ پورا وارڈ ہوتا ہے۔ وارڈ کئی کمروں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ۲۰ سے ۵۰ تک مریض ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد اتنے مریضوں پر نگرانی رکھ سکتا ہے اور نہ ہی کنٹرول کر سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس بدنظمی کی وجہ سے ایک ملازم اور ایک مریض کی موت واقع ہو گئی۔

انتظامیہ کی مزدور دشمن پالیسی کے پیشِ نظر ہسپتال کے ملازمین نے اپنے روزگار اور دیگر حقوق کے تحفظ کے لئے ایک یونین بنائی۔ چند جائز اور قانونی مطالبات پیش کئے، لیکن انتظامیہ انتقامی کارروائیوں پر اتر آئی۔ اور متعدد ملازمین کو برطرف کر دیا گیا، بعض کو معطل کر دیا گیا۔ معطل ہونے والوں میں یونین کے نائب صدر سردار علی اور جنرل سیکرٹری احمد عمر بھی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ چند ایسے ملازمین کو ریٹائر کیا گیا جن کی عمریں ۵۰ سال سے کم تھیں۔ صحت اچھی تھی اور کارکردگی اعلیٰ تھی۔ اس کے برعکس اپنے خوشامدی ملازمین کو ریٹائر نہیں کیا گیا جو عمر، صحت اور سروس رولز کے اعتبار سے ملازمت کے قابل نہیں ہیں۔ انتظامیہ اہلیت، صلاحیت اور ملازمت کی مدت کی بناء پر ترقیاں نہیں دیتی بلکہ جو خوشامد کرتا ہے، اسے ترقی مل جاتی ہے۔ ہسپتال کے ملازمین کی رہائش کیلئے سرکاری کواٹروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔ یونین کے مطالبہ پر چند مکانوں کی ناقص اور ادھوری مرمت کرائی گئی۔ انتظامیہ نے مزدور اتحاد کو توڑنے کے لئے ایک ہی درجہ کے ملازمین کو دو قسم کے کوارٹر دیئے۔

اس صورتِ حال سے نہ صرف مینٹل ہسپتال کے ملازمین بلکہ پورے حیدرآباد کی مزدور برادری میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ فوراً مداخلت کرے اور بدعنوان حکام کا محاسبہ کرے۔

بقیہ • بندرین اور نغمہ

صوم وصلوٰۃ کے خاصے پابند تھے۔ بات چیت بھی مذہب کے متعلق رہی۔ چونکہ طارق عزیز نے قصے کہانیوں کی بجائے مذہب کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے، اس لئے متمول حضرات ان سے خاصے متاثر ہوئے۔ دوسرے دن جن صاحب کے ذریعہ طارق عزیز کو بلوایا گیا تھا انکے ذریعہ پیغام دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو سیٹھوں کے خرچ پر حج کر آئیں۔ اس مد میں متمول حضرات انہیں ۲۵ ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہیں۔"

طارق عزیز نے انہیں پیغام بھجوایا۔ "وہ روپے بھی سیلاب فنڈ میں دے دیں۔ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا سب سے بڑا دینی فریضہ ہے۔ حج کا ثواب دونوں کو پہنچ جائے گا۔" شائد اس کے بعد ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔

طارق عزیز اور ان کے دوست فنکار اپنا کام ختم کر کے واپس لاہور چلے گئے۔ ہمارے فلمی فنکاروں نے اس نازک گھڑی میں فرض شناسی کے جس جذبے کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ملک و قوم پر جب بھی آزمائش کا کوئی کڑا وقت آیا، حساس فنکار عوام کے شانہ بشانہ میدانِ عمل میں نکل آئے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اسی معاشرے کا ایک حساس، بیدار، اور باشعور حصہ ہیں۔ وہ عوام سے علیحدہ نہیں بلکہ عوام ہی میں سے ہیں۔

Regd No : S - 2772

Weekly "Al - Fatah" Karachi 20-27 SEPT, 1975